ڈاکٹر عبدالمغنی

ڈاکٹر عبدالمغنی ریاست بہار کے دانشوروں اور تنقید نگاروں میں ممتاز ہیں۔ عہد حاضر میں شعروادب اور فکرونظر کو وسعت اور شفافیت کے ساتھ پیش کرنے والوں اور ایک مخصوص تنقیدی اصول کو مقبول بنانے میں ڈاکٹر عبدالمغنی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے والد مولانا عبدالرؤف ایک معروف عالم دین تھے۔ ان کا تعلق ضلع اورنگ آباد (بہار) سے ہے، ڈاکٹر عبدالمغنی کی پیدائش وہیں 1934ء میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ آگے کی تعلیم کے لئے انہوں نے مدرسہ شمس الہدیٰ میں داخلہ لیا۔ یہاں سے انہوں نے عالم کی سند حاصل کی۔ مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ انہوں نے عصری تعلیم کی طرف بھی توجہ دی اور انگریزی میں ایم اے کیا۔ ملازمت کا وقت آیا تو انگریزی کے لکچرر کی حیثیت سے پٹنہ یونی ورسٹی کے پٹنہ کالج میں ان کا تقرر ہوا۔ بعد میں ان کا تبادلہ بی این کالج میں ہوگیا۔ جہاں سے وہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

پروفیسر عبدالمغنی نے شعروادب کی متعدد اصناف کے بارے میں اپنے مطالعات پیش کئے ہیں۔ اقبال ان کا خاص موضوع رہا ہے، وہ تقریباً بیس کتابوں کے مصنف ومؤلف ہیں۔ زندگی اور ادب کے حوالے سے وہ ایک مخصوص تعمیری نقطہ نظر کے حامل تھے اور انہوں نے اسے کامیابی کے ساتھ اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔ ان کی اہم ترین تنقیدی تالیفات میں جادۂ اعتدال، نقطہ نظر، معیار واقدار، تشکیل جدید، اقبال اور عالمی ادب وغیرہ ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی کی وفات پٹنہ میں 5/ستمبر 2006ء میں ہوئی۔

ادب کی پہچان

ادب کو جاننے سبھی لوگ ہیں مگر پہچاننے بہت کم ہیں، ادب پڑھنے والوں کا حلقہ روز بہ روز بڑھتا جارہا ہے لیکن ادب سمجھنے والوں کا حلقہ اسی نسبت سے گھٹتا جارہا ہے۔ آج ناول، افسانہ یا رسالہ خاص کر ڈائجسٹ، ہر پڑھے لکھے آدمی کی میز پر مل جائے گا، مگر ان ادبی شکلوں کی قدر شناسی اس آدمی کے لئے بہت دشوار ہے، چنانچہ وہ ادب کے نام سے پڑھ تو لیتا ہے بازار میں چلتی ہوئی بہت سی چیزوں کو، لیکن یہ بھی نہیں جانتا کہ ان میں کون ادب ہے اور کون نہیں اور جو چیزیں واقعی ادب ہیں ان کے درمیان تنقیدی موازنہ اور ان کی باہمی خوبی و خامی کو سمجھنا تو اس کے لئے بالکل محال ہی ہے۔ اس صورت حال کے نتیجے میں آج ادب اور غیر ادب خلط ملط ہو کر رہ گئے ہیں۔

اس لئے بہت ضروری ہے کہ ادب کی پہچان پر گفتگو کی جائے۔ یہاں پہنچ کر ہمیں اپنی حقیقی مشکل کا احساس ہوتا ہے۔ گرچہ ادب کی تعریف و تشریح صدیوں سے ہوتی چلی آرہی ہے اور اس موضوع پر بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں۔ مگر آج تک یہ تعین کرنا دشوار ہے کہ واقعتاً ادب کیا ہے، اس کی کیا حدیں ہیں اور کیا صفتیں؟ اس سلسلے میں سب سے بڑا اور بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا کسی زبان میں لکھی جانے والی ہر علمی تحریر ادب ہے؟ کچھ لوگوں کا خیال یہی ہے کہ فلسفہ، معاشیات، دینیات اور اخلاقیات، تاریخ اور طبیعیات وغیرہ علوم وفنون میں مختلف موضوعات پر جو کچھ بھی ادبیت کے ساتھ لکھا جائے، وہ ادب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ادب درحقیقت ایک اسلوب، ایک طرز بیان کا نام ہے، اس کا کوئی خاص موضوع اور مواد نہیں ہے۔ چنانچہ ادب کی تاریخوں میں ادبی اسلوب میں لکھی ہوئی ہر قسم کی تحریروں کو ادب کے ذیل میں درج کیا گیا ہے۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ادب دراصل ایک خاص قسم کی تحریر کا نام ہے اور ادب کا صرف ایک خاص اسلوب ہی نہیں بلکہ ایک خاص مواد بھی ہے، یعنی ادب کے خام وسائل جو بھی ہوں مگر تخلیق کی شکل میں اس کا ایک مخصوص موضوع بھی ہے اور ہیئت بھی۔ بلکہ یوں کہئے کہ ادب کے کچھ خاص خاص موضوعات اور ہئتیں ہیں، جن کا اظہار

کچھ متعین صنفوں میں ہوتا ہے، چنانچہ جو کچھ ان صنفوں میں لکھا جائے وہی ادب ہے اور جو کچھ ان صنفوں کے باہر ہے وہ ادب نہیں ہے۔ خواہ اس کے اندر کتنی ہی ادبیت پائی جائے، اس لئے کہ ادب ایک خاص شکل کا نام ہے، جیسے شاعری، ڈراما، ناول، افسانہ۔

اس نقطۂ نظر کے بھی دو مکتب فکر ہیں، ایک یہ کہ جو کچھ ادب کی مقررہ ہیئتوں میں لکھا جائے وہ ادب ہے۔ خواہ وہ جس معیار کا بھی ادب ہو۔ دوسرے یہ کہ ادب کی شکل میں نظر آنے والی ہر چیز ادب نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ادب صرف ایک بنی بنائی ہیئت کا نام نہیں، بلکہ یہ درحقیقت ایک خاص معیار ہے جو ادب کی کسی بھی ہیئت میں لکھنے والا خود ہی بناتا ہے۔ یعنی جب تک کسی تحریر میں تخلیقی انفرادیت نہ ہو وہ ادب صحیح اور پورے معنوں میں ادب نہیں ہے اور تخلیقی انفرادیت سے محروم تحریریں محض میکانکی اور مصنوعی ہیں۔ اس مکتب فکر کے مطابق رسمی، فرسودہ، سطحی اور سستی چیزیں ادب نہیں ہیں اور ادب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ تحریر میں تازگی، جدت، بلندی اور گہرائی ہو۔

ادب کا یہ آخری معیار بہت کڑا ہے اور اس تصور کے مطابق ادب کا دائرہ بہت ہی محدود ہو جاتا ہے لیکن اس معیار و تصور میں بھی مزید شدت پیدا کرنے والا ایک اور مکتب فکر ہے، وہ یہ کہ ادبی ہیئت کی تمام شرطوں اور تخلیق کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد بھی معیاری ادب قرار پانے کے لئے ضروری ہے کہ ایک تحریر اعلا سنجیدگی کی حامل ہو اور اس کے اندر تنقید حیات پائی جائے، یعنی مکمل اور کامل ادب وہ ہے جس میں بہترین فن کا اظہار بہترین فکر کے ساتھ کیا گیا ہو، جس میں اسلوب کی نفاست کے ساتھ ساتھ موضوع کی متانت بھی ہو، جس میں مواد کی ثقاہت اور ہیئت کی لطافت دونوں موجود ہوں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ادب کا ایک معیار متعین کرنا ہو تو ضروری ہوگا کہ ایک مکمل نمونہ ادب کی تعریف کی جائے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ادب کے دو اجزائے ترکیبی ہیں، ایک فکر، دوسرے فن اور ایک مکمل ادبی تخلیق اسی وقت بروئے کار آئے گی جب فکر اور فن دونوں ہی اعلیٰ درجے کے ہوں اور ان کے درمیان کامل ہم آہنگی بھی پیدا ہو جائے، اس طرح کہ دونوں ایک دوسرے میں پیوست اور ضم ہو جائیں اور اس ازدواج کے نتیجے میں ایک ناقابل تقسیم تخلیقی مرکب نمودار ہو، اور یہ مرکب زندگی اور ادب کی بہترین قدروں کا مظہر ہو، اس سے انسانی تہذیب کی جمالیات اور اخلاقیات دونوں کو فروغ ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس معیار پر پوری اترنے والی تحریر ہی ادب ہے اور اس سے کم تر جو کچھ ہے وہ ادب نہیں ہے؟ میرا خیال ہے کہ ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا۔ زندگی کے کسی بھی کام کا معیار اس کے کمال کو ظاہر کرتا ہے، جب کہ دنیا کی ہر چیز درجۂ کمال پر نہیں ہوتی، بلکہ اس درجے سے نیچے بھی چیزوں کا وجود ہوتا ہے جس سے انکار کرنا حقیقت کے خلاف ہوگا۔ لہٰذا معیارِ کمال کی نشان دہی کرتے ہوئے بھی وجود کی پہچان بالکل ضروری ہے۔ سب سے پہلی چیز کسی ہستی کی بنیادی تعریف ہے، اس کے بعد اس کی تکمیل کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا کام ادب کی نوعیت کا سراغ لگانا ہے۔ اس کے بعد اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کی نوبت آئے گی، ادب کی پہچان کے بعد اس کی پرکھ ہو سکے گی۔ جب تک ادب کے عناصر معلوم ہوں اس کے اوصاف کا پتہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ادب کو صرف دو حصوں میں تقسیم کرنے کی ضرورت ہوگی، ایک عام ادب اور دوسرے خاص ادب۔ عام ادب کے ذیل میں ہر وہ تحریر آجائے گی جس کے اندر ادبیت پائی جاتی ہو، خواہ اس کا تعلق فلسفہ و حکمت سے ہو یا سیاست و معیشت اور دینیات و اخلاقیات سے، جب کہ خاص ادب صرف ان تحریروں کو کہا جائے گا جو کسی مخصوص تخلیقی ہیئت میں لکھی گئی ہوں، جیسے ناول، افسانہ، شاعری اور ڈراما کی صنفیں۔ اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ عام ادب ایک علمی چیز ہے جب کہ خاص ادب ایک فنی چیز ہے۔

اب جہاں تک علمی ادب کا تعلق ہے اس کی صرف ایک پہچان ہے، وہ یہ کہ اس کے اسلوب بیان میں ادبیت پائی جاتی ہو، اس کے طرز اظہار میں محاورات، امثال، تشبیہات و استعارات اور تلمیحات و کنایات کی چاشنی ہو، مختصر یہ کہ ایک اچھی طرح لکھی ہوئی، دلچسپ اور خیال انگیز، موثر اور دل نشیں نثر ہو۔ دوسری طرف فنی ادب کی پہچان بس یہ ہوگی کہ فن کی جس صنف میں اس کی تخلیق کی گئی ہو اس کی مقررہ ہیئت کے مسلمہ اصول و قواعد کی پابندی اس میں بنیادی طور سے کی گئی ہو، خواہ اس پابندی کے علاوہ اس میں جدت و انفرادیت کا کوئی نشان نہ ہو اور خواہ ایک انفرادی اجتہاد کے ذریعے قائم شدہ روایت کی توسیع و تجدید کا کتنا ہی سامان کیا گیا ہو۔ ادب کی شکل میں پائی جانے والی اور فنی ضوابط پر پوری طرح اترنے والی ہر چیز بہ ہر حال ادب ہے، خواہ تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ہم اس چیز کی اچھائی کا اعتراف کریں یا اس کی برائی پر اعتراض کریں۔

اس طرح ادب کی ایک بنیادی اور عمومی تعریف اور پہچان ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ سوال پھر بھی رہ جاتا ہے کہ اگر ادب ایک ذوقی اور تخلیقی چیز ہے تو کیا ہم ادب کی صرف اس پہچان پر اکتفا کر لیں اور اس کی پرکھ کی طرف کوئی

توجہ نہ دیں؟ یہ سوال بہت اہم ہے، اس لئے کہ پڑھنے والوں سے صرف ادب پڑھنے کی توقع نہیں کی جاتی ہے بلکہ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ وہ ادب کا تنقیدی مطالعہ کریں گے۔ اس سلسلے میں ادب پر خاص کر ادیب کے نقطہ نظر سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ ادب کے کسی بھی معنی اور صنف پر لکھنے والوں کے بارے میں اصولی طور پر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ وہ تخلیقی جس کے ساتھ ہی ساتھ ایک تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں، اس لئے کہ ادب کی تخلیق بہ ہر حال ایک ذمے داری کی بات ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ جو شخص دنیا کے سامنے ادب پیش کرنا چاہتا ہے وہ صرف لوگوں کے سامنے اپنا دل کھول کر نہیں رکھ دے گا، بلکہ اپنے منتخب کیے ہوئے موضوع، اسلوب اور ہیئت کے بنیادی تقاضوں کے پیش نظر وہ شخص چھان پھٹک اور سوچ بچار کر کے کچھ خاص نکتے ایک مخصوص انداز میں بیان کرے گا، اس لئے کہ ادب بہ ہر حال محض زبان سے بالیدہ تر ایک اظہار خیال کا نام ہے، اور ہر تحریر ادب نہیں ہے، خواہ ادب کی جو بھی تعریف کی جائے، ادب کے کچھ نہ کچھ حدود اور خواص تو ہوں گے ہی، جن کی بنیاد پر ادب کو غیر ادب سے ممتاز کیا جا سکے گا۔ لہٰذا ضروری ہوگا کہ جو چیز غور و فکر سے لکھی گئی ہے اسے غور و فکر سے پڑھا اور سمجھا بھی جائے۔ اس طرح ادب کی پہچان کے ساتھ ساتھ پرکھ بھی کچھ نہ کچھ کرنی ہی پڑے گی اور جب پرکھی ہوئی پہچان کا معاملہ ہوگا تو ہمیں غیر معیاری اور سطحی چیزوں سے صرف نظر کر کے معیاری اور عمدہ چیزوں کی قدر شناسی کرنی ہی پڑے گی، تا کہ ادب کا معیار لکھنے اور پڑھنے والوں کے درمیان بہ ہر حال قائم رہے۔

لفظ و معنی

دانشور	۔	پڑھا لکھا ہونا، عقلمند، ذہین
نقاد	۔	وہ شخص جو تنقید لکھتا ہو، جانچ پرکھ کرنے والا
ممتاز	۔	سب سے الگ، دوسروں سے جدا ہونا، انتخاب کیا گیا، افضل
عہد حاضر	۔	وہ زمانہ جو چل رہا ہو، موجودہ دور
شعر و ادب	۔	شاعری اور وہ تخلیق جو ذہنی آسودگی پیدا کرے
فکر و فن	۔	سوچ، خیال، تخلیقی سوچ

وسعت - پھیلاؤ

شفافیت - صفائی، سادگی

مخصوص - خاص

اصول - قانون، معیار

مقبول - ہر دلعزیز، لوگوں میں پسند کیا جانے والا

موازنہ - ایک سے دوسرے کا مقابلہ کرنا

باہمی - آپسی، باہم، ایک دوسرے کے ساتھ

خلط ملط - ملا جلا ہونا، ایک دوسرے میں الجھ جانا

تعین - کسی چیز کی حد مقرر کرنا

خام وسائل - وہ ذرائع جو معاون ہوں

ہیئت - بناوٹ

تخلیقی انفرادیت - فن کار کی اپنی پہچان، اس کی اپنی طرز

لطافت - خوبصورتی، نزاکت

ناقابل تقسیم - جس کو بانٹا نہ جا سکے، ٹکڑے ٹکڑے نہ کیا جا سکے

قدروں کا مظہر - خوبیوں کا مالک ہونا

تہذیب - اپنی روایت سے جڑا ہونا

اخلاقیات - اطوار کو سدھارنے والی اچھائیاں

ہستی - زندگی، شخصیت، وجود

نوعیت - قسم

اسلوب - طریقہ، طرز

ضوابط - قانون، اصول

ذوق - رجحان

بالیدہ - پختہ، تجربہ کار

صرفِ نظر - توجہ سے ہٹانا، درگزر کرنا، کنارے کرنا

آپ نے پڑھا

- ہم ادب کی پہچان کس طرح کریں ایک فن کار اپنے فن کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ وہ کتنا ادبی ہے۔ عبدالمغنی کا مضمون ادب اور اس کی پہچان میں مکمل زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ ہر تحریر ادبی نہیں ہوتی اور ہر ادب کا معیاری ہونا بھی لازمی ہے۔ ایک فن کار اپنا فن یا فنی نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس میں وہ کس موضوع کو پیش کر رہا ہے اور کس انداز میں پیش کر رہا ہے یہ سبھی باتیں شامل ہوتی ہیں۔
- وہ فنی نمونہ جسے پڑھ کر ہمارے اندر سرور اور انبساط محسوس ہو اور ہم آسودگی کا احساس کریں وہ ادب میں شامل ہوتا ہے۔ ادب انسان کی ذہنی اور روحانی تربیت کرتا ہے یہ وہ شئے ہے جو تہذیب انسانی بھی سناتا ہے اور ہمیں مہذب بنانے میں معاون بھی ہوتا ہے۔ اس طرح ادب ہمارے لئے تاریخی دستاویز بھی ہوتا ہے اور ہماری رہنمائی مستقبل میں بھی کرتا ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. نصاب میں شامل مضمون 'ادب کی پہچان' کے مضمون نگار کون ہیں؟
2. ڈاکٹر عبدالمغنی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
3. ڈاکٹر عبدالمغنی کی دو کتابوں کے نام لکھئے۔
4. ڈاکٹر عبدالمغنی نے کس مدرسے میں کہاں تک تعلیم حاصل کی؟
5. ڈاکٹر عبدالمغنی نے اپنی ملازمت کا آغاز کس کالج سے کیا؟

مختصر سوالات

1. ڈاکٹر عبدالمغنی کی تنقید نگاری پر پانچ جملے لکھئے۔
2. 'ادب کی پہچان' پر مختصر روشنی ڈالئے۔
3. 'ادب کی پہچان' کے حوالے سے ادب کی مختصر تعریف لکھئے۔

طویل سوالات

1. ڈاکٹر عبدالمغنی کی تنقید نگاری پر تفصیلی روشنی ڈالئے۔
2. 'ادب کی پہچان' کے حوالے سے ادب کے تعلق سے مختلف نظریات بیان کیجئے۔
3. اردو ادب میں تنقیدی روایات کا جائزہ لیجئے۔

آیئے، کچھ کریں

1. ڈاکٹر عبدالمغنی کی مطبوعات کی ایک فہرست تیار کیجئے۔
2. ڈاکٹر عبدالمغنی کی شخصیت اور ادبی خدمات پر ایک مذاکرہ کیجئے۔

ہندوستانی آئین کے معمار
ڈاکٹر بھیم راؤ امبیدکر

ہندوستان کے اکثریتی سماج میں کچھ لوگ پسماندہ طبقے کے مانے جاتے تھے۔ سیکڑوں برسوں سے سماج میں نہ کوئی ان کی فکر کرتا تھا اور نہ ان سے پیار کرتا تھا۔ بلکہ وہ لوگ نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور انہیں اچھوت کہا جاتا تھا۔

اونچی ذات کے لوگ ان اچھوتوں کو اپنے درمیان رہنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ وہ ان کے کنوؤں کے پانی کو نہیں چھو سکتے تھے، نہ ان کے تالابوں سے پانی بھر سکتے تھے۔ اچھوت مندر میں نہیں جا سکتے تھے۔ نہ کسی اسکول میں تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ ان کا کام سڑکوں، گلیوں میں جھاڑو لگانا، جوتے بنانا یا جوتوں کی مرمت کرنا، بید کے ٹوکرے بنانا یا مردہ جانوروں کی کھال اتارنا تھا۔

سیکڑوں برسوں تک یہ اچھوت غریبی، جہالت، سخت جانفشانی اور ان گنت تکلیفوں کی زندگی جیتے رہے۔

ایسے ہی ایک اچھوت، مراٹھی زبان بولنے والے مہار خاندان میں ڈاکٹر بھیم راؤ امبیدکر 14/اپریل 1891 کو مہو، سنٹرل انڈیا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام رام جی مالوجی سکپال اور والدہ کا نام بھیم بائی تھا۔ وہ اپنے والدین کی چودھویں اور سب سے چھوٹی اولاد تھے۔ سب لوگ پیار سے انہیں بھیما کہا کرتے تھے۔ انہوں نے بھیم راؤ کے نام سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ اپنے دادا مالوجی کی طرح سے ان کے والد رام جی سکپال برطانوی سرکار کی فوج میں ملازم تھے۔

ان دنوں برطانوی سرکار نے فوج میں کام کرنے والوں کے لئے تعلیم کو لازمی قرار دے رکھا تھا۔ سرکار ان نوجوانوں کی عورتوں اور بچوں کی تعلیم کے لئے اسکول چلاتی تھی۔ مالوجی اور رام جی دونوں ایسے خوش قسمت مہار تھے جن کو تعلیم کا فائدہ پہنچا۔

بھیم راؤ کی عمر ابھی دو برس کی ہی تھی کہ ان کے والد فوج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ 14 برس تک رام جی فوجی اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ سبکدوشی کے وقت ان کا عہدہ دوسری گرینڈ یرز میں صوبے دار میجر کا تھا۔ یہ خاندان سنٹرل انڈیا کو چھوڑ کر کونکن علاقہ میں داپولی مقام پر جا بسا۔ یہیں پانچ سال کی عمر میں امبید کر کا اسکول میں داخلہ ہوا۔ جلد ہی ان کے والد رام جی کو ستارا میں نوکری مل گئی۔ اس طرح یہ خاندان ستارا چلا گیا۔ یہاں پر بھیم راؤ کا چھاؤنی میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ ہوگیا۔

بھیم راؤ ابھی چھ سال کے ہی تھے کہ ان کی ماں بھیما بائی کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ رام جی کی بہن نے اس خاندان کی دیکھ بھال شروع کردی۔

بھیم راؤ کو اب اس کڑوی سچائی کا احساس ہونے لگا تھا کہ وہ پیدائشی طور پر اچھوت ہیں۔ آگے چل کر ایسے ایسے واقعات ان کی زندگی میں رونما ہوئے کہ انہیں اپنے مذہب اور ہم مذہبوں سے نفرت ہونے لگی۔

ستارا میں تعلیم کے دوران انہوں نے اپنے نام کے آگے امبید کر لکھنا شروع کیا۔ دراصل بھیم راؤ کے دادا، پردادا کونکن علاقے میں امباواڈے کے رہنے والے تھے۔ مراٹھی زبان بولنے والے لوگوں کی روایت ہے کہ وہ اپنی ذات کے ساتھ اپنے رہائشی مقام کا نام لگاتے ہیں۔ چنانچہ سکپال کے ساتھ بھیم راؤ کو دوسرا سرنیم امباواڈیکر ملا۔ جسے بولنے میں آسانی کے لئے اسکول کے رجسٹر میں امبید کر لکھ دیا گیا۔

تعلیم کے معاملے میں شروع میں تو بھیم راؤ سنجیدہ نہیں تھے لیکن آگے چل کر انہیں جب تعلیم کی اہمیت کا احساس ہونے لگا تو انہوں نے اپنی تعلیم پر دھیان دینا شروع کیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب رام جی کی ستارا والی نوکری ختم ہوگئی اور ان کا خاندان بمبئی منتقل ہوگیا۔ بمبئی کے ایلفنسٹن ہائی اسکول کا ماحول، جس میں بھیم راؤ پڑھتے تھے، پرسکون نہ تھا۔ یہ اسکول سرکاری تھا لیکن یہاں بھی بھیم راؤ کے ساتھ ذات پات کا بھید بھاؤ کیا جاتا تھا۔ صرف اسکول کے طلبہ ہی انہیں حقارت اور نفرت کی نظر سے نہ دیکھتے تھے بلکہ اساتذہ کا سلوک بھی ویسا ہی تھا۔ لیکن بھیم راؤ خاموشی کے ساتھ اپنی بے عزتی برداشت کرتے رہے۔ ان کی تعلیم جاری رہی اور انہوں نے 1908 میں میٹرک کا امتحان پاس کرلیا۔ مہار ذات والوں کے لئے یہ بڑے فخر کی بات تھی۔ اس لئے ان لوگوں نے اس خوشی کے اظہار کے لئے ایک جلسہ کیا اور بھیم راؤ کو مبارک باد دی۔ اس سے بھیم راؤ کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ انہوں نے اب ایلفنسٹن کالج میں داخلہ لیا اور 1912 میں اسی کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد بڑودہ اسٹیٹ

سے تعلیمی وظیفے پر وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے امریکہ چلے گئے اور کولمبیا یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ انہوں نے معاشیات میں اسی یونی ورسٹی سے ایم اے پاس کیا۔ اس کے بعد 1916 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال وہ انگلینڈ چلے گئے اور لندن اسکول آف اکنامکس میں داخلہ لے لیا۔ اسی کے ساتھ ہی وہ اکنامکس میں ایم ایس سی اور بیرسٹری کی تیاری کرتے رہے۔ لیکن 1917 میں ان کا یہ تعلیمی سلسلہ اس وقت رک گیا جب بڑودہ اسٹیٹ سے ملنے والا وظیفہ، جو ایک خاص مدت کے لئے تھا، بند ہو گیا۔ نتیجتاً انہیں ہندوستان واپس آجانا پڑا۔

ہندوستان واپس آکر انہوں نے پروفیسر آف کامرس اور اکنامکس کی حیثیت سے سیڈی ہام (Sydeham) کالج میں ملازمت شروع کر دی۔ اس عہدے پر 1918ء سے 1920ء تک وہ کام کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے اپنی تنخواہ کے کچھ روپے بچا کر محفوظ کر لئے تھے اور کچھ دوسرے مخلصین نے امداد کی جس کی بدولت وہ دوبارہ 1920ء میں انگلینڈ چلے گئے اور اپنی ادھوری تعلیم پوری کی۔ انہوں نے 1921ء میں ایم ایس سی اور 1923ء میں ڈی ایس سی کی ڈگریاں حاصل کیں اور بیرسٹری بھی پاس کر لی۔ اس کے بعد ہندوستان واپس آگئے۔

ہندوستان واپس آکر انہوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور اس وقت سے وہ سماجی اصلاح اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگے۔ اس دوران انہوں نے صحافت سے بھی خود کو جوڑا۔ اصلاح کے لئے انہوں نے کئی سیاسی اور سماجی تنظیمیں قائم کیں اور آخر کار انہوں نے اچھوت سمجھی جانے والی ذاتوں میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا جس کے اثرات آج واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

انہوں نے اچھوتوں کو یہ صلاح دی کہ 'ہم اس وقت تک کوئی ترقی نہیں کر سکتے جب تک ہم تین مرحلوں میں اپنے اندر کی صفائی نہیں کرتے۔ ہمیں اپنے عام اخلاقی برتاؤ کو اوپر اٹھانا ہوگا۔ اپنے تلفظ کو سدھارنا ہوگا اور خیالات کو نئی طاقت دینی ہوگی۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ عہد کر لیں کہ آپ مردہ یا سڑے ہوئے جانوروں کا گوشت نہیں کھائیں گے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے درمیان سے اونچ نیچ کے بھید بھاؤ ختم کر دیں۔ آپ عہد کیجیے کہ آپ بچے کھچے اور پھینکے ہوئے ٹکڑے نہیں کھائیں گے۔ ہم خود صرف اسی صورت میں اوپر اٹھ سکتے ہیں اگر ہم اپنی مدد آپ کریں۔ اپنی عزت نفس دوبارہ حاصل کریں اور اپنی طاقت کو جانیں۔'

بھیم راؤ نے جو تحریک چلائی اس کی اونچی ذات کے لوگوں کی طرف سے زبردست مخالفت ہوئی۔ لیکن انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ انہوں نے قانونی طور پر بھی مخالفوں کی مخالفت کا جواب دیا اور وہ جس تحریک یا مشن کو

لے کر چلے تھے، اس میں کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے ملک وقوم کی اہم خدمات بھی انجام دیں۔ اس لئے ان کا شمار جدید ہندوستان کے معماروں میں ہوتا ہے۔

بھیم راؤ امبید کر کے کارناموں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ وہ عملی سیاست کے میدان میں بھی کودے اور کامیاب رہے۔ چنانچہ اس دور کے اہم سیاسی رہنماؤں مثلاً گاندھی جی اور نہرو جی سے بھی ان کے نزدیکی مراسم رہے۔ چنانچہ آزادی کے بعد جب ملک کی آئین سازی کا مرحلہ درپیش آیا تو دستور ساز کمیٹی میں وہ صدر کے عہدے پر فائز کئے گئے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ جب ان کی عمر چودہ برس تھی اور وہ پانچویں درجے کے طالب علم تھے تو ان کی شادی 9 برس کی لڑکی رامابائی سے ہوئی تھی۔ رامابائی کے انتقال کے بعد انہوں نے ایک اونچی ذات کی تعلیم یافتہ خاتون سے شادی کی۔

بھیم راؤ امبید کر ہندوستانی سماج میں چھوا چھوت کے رواج سے بہت ہی برہم اور بیزار تھے۔ اس لئے انہوں نے بدھ مذہب قبول کرلیا۔ ان کے اس قدم سے متاثر ہوکر دوسرے اچھوت طبقہ کے لوگوں نے بھی کثیر تعداد میں اپنا مذہب تبدیل کرلیا اور بودھسٹ ہوگئے۔ آگے چل کر وہ صرف اچھوتوں کے رہنما ہی نہیں رہے بلکہ ہندوستانی قوم کے رہنما سمجھے جانے لگے۔ وہ بودھ مذہب کے ماننے والوں میں بھی احترام کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ مذہبی تقاریب اور تقاریر کے سلسلے میں انہیں ان ممالک سے بھی دعوت نامے ملنے لگے جہاں بودھوں کی کافی تعداد ہے۔ بہت سارے اعزازات سے بھی نوازے گئے۔ ہندوستان کے سب سے بڑے اعزاز 'بھارت رتن' سے نوازے گئے۔

6 دسمبر 1956ء کی رات ڈاکٹر بھیم راؤ امبید کر سونے کے لئے بستر پر گئے تو نیند ہی میں وفات پاگئے۔ بودھ دھرم کے ماننے والے کہتے ہیں انہیں نروان مل گیا۔

ڈاکٹر بابا صاحب بھیم راؤ امبید کر نے زندگی بھر انتھک کوششیں کیں۔ ان کا مقصد تھا کہ پسماندہ طبقات کو بیدار کرنا، اٹھانا اور ہندوستانی سماج میں برابری اور بھائی چارگی پیدا کرنا۔ ڈاکٹر امبید کر نے ہمارے ملک کو وہ دستور دیا جو مذہب، ذات، عقیدہ اور جنس کے امتیاز کو ختم کرتا ہے اور تہیہ کرتا ہے کہ ملک کے تمام لوگوں کو یکساں مواقع فراہم کرے گا۔ یہ دستور مرد مرد کے درمیان اور عورت اور مرد کے بیچ مساوات قائم کرتا ہے۔ اس میں عام لوگوں کو

شادی بیاہ، طلاق، گود لینے، وراثت اور تعلیم کے حقوق دیئے گئے ہیں۔

اس طرح بھیم راؤ امبیدکر نے ہندوستان کی دستور سازی میں ایک اہم اور تاریخی کردار ادا کیا۔ علاوہ ازیں دستور ہند میں سیکولرزم کا تصور پیش کر کے ہندوستان کے کثیر مذہبی اور کثیر لسانی معاشرے میں مساوات پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی جو ہندوستانی جمہوریت کے روشن مستقبل کی ضامن ہے۔

ماخوذ

لفظ و معنی

پسماندہ طبقہ	-	پچھڑی ہوئی آبادی کے لوگ
حقارت کی نظر سے	-	کسی کو نیچی نگاہ سے دیکھنا، ذلیل اور کم تر سمجھنا
جانفشانی	-	محنت، مشقت
اچھوت	-	جن کو چھونے کے لائق بھی نہیں سمجھا جائے
ملازمت	-	نوکری
روایت	-	کوئی رواج جو بہت زمانے سے چلا آرہا ہو
حوصلہ افزائی	-	حوصلہ بڑھانا، دلجوئی کرنا
وظیفہ	-	تعلیم کے لئے امدادی رقم، اسکالرشپ
مخلصین	-	خلوص والے، ہمدرد
تنظیم	-	کوئی کام کرنے کے لئے بنایا گیا ادارہ
معمار	-	بنانے والے
برہم	-	ناراض
بیزار	-	پریشان
احترام	-	عزت
اصلاح	-	سدھار، بہتری
منتقل	-	ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جانا

معاشیات - ایکونومکس، مادی وسائل اور ذرائع سے متعلق ایک شعبہ علم

مراسم - تعلقات

رہنما - لیڈر

آپ نے پڑھا

- ہندوستان کے اکثریتی فرقہ میں صدیوں سے ایک سماجی برائی چلی آرہی ہے جس کا نام چھوا چھوت ہے۔ اکثریتی فرقے کے اونچی ذات کے لوگ نیچی ذات کے لوگوں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے ہیں، یہاں تک کہ ان کو اپنے پاس سے گزرنے کی بھی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ نہ انہیں مندر میں پوجا کرنے دیتے ہیں، نہ ہی اپنے کنویں سے پانی بھرنے دیتے ہیں۔
- ایسے ہی سماج میں بھیم راؤ امبیدکر کی پیدائش ہوئی تھی۔ انہیں بھی طرح طرح کی ذلتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایسے حالات سے ان کے والد اور دادا کو بھی گزرنا پڑا تھا۔
- امبیدکر حالات کے آگے جھکے نہیں، بلکہ انہوں نے حالات کو بدلنے کی کوشش کی تاکہ حقارت کی نگاہ سے دیکھی جانے والی نیچی ذاتوں کو حق اور انصاف ملے۔ اس کے لئے وہ مسلسل کوشش کرتے رہے اور لڑائی لڑتے رہے۔ ان کا ایک بہت بڑا کام ہندوستان کی دستور سازی ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. بھیم راؤ امبیدکر کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
2. بھیم راؤ امبیدکر کے والدین کے نام لکھیے۔
3. بھیم راؤ کے والد فوج میں کس عہدے سے سبکدوش ہوئے؟
4. بھیم راؤ کی شادی کس عمر میں اور کس سے ہوئی؟
5. بی۔اے کرنے کے لئے بھیم راؤ نے کس کالج میں داخلہ لیا؟
6. بدھ مذہب میں 'نروان' کا کیا تصور ہے؟

مختصر سوالات

1. اسکول میں بھیم راؤ کے ساتھ طلبہ اور اساتذہ کا سلوک کیسا تھا؟
2. بھیم راؤ کا خاندان ممبئی جا کر کیوں بس گیا؟
3. بھیم راؤ کے حصول تعلیم پر پانچ جملے لکھئے۔
4. بھیم راؤ امبیدکر کی آئینی خدمات کو مختصراً بیان کیجئے۔

طویل سوالات

1. بھیم راؤ امبیدکر کی سوانح لکھئے۔
2. ڈاکٹر بھیم راؤ امبیدکر کی آئینی خدمات کا جائزہ لیجئے۔
3. آزاد ہندوستان کے معاشرتی انقلاب میں امبیدکر کی خدمات پر روشنی ڈالئے۔

آیئے، کچھ کریں

1. ڈاکٹر بھیم راؤ امبیدکر کی شخصیت پر طلبہ کے ساتھ ایک مذاکرہ کیجئے۔
2. ڈاکٹر بھیم راؤ امبیدکر کی سیاسی، آئینی اور معاشرتی خدمات کی ایک فہرست تیار کیجئے۔

لطف الرحمٰن

ان کا اصل اور ادبی دونوں نام لطف الرحمٰن ہے۔ ان کی پیدائش چھپرہ ضلع کے بنیار پور قصبہ میں 1941ء میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام مولوی عبدالغفور مرحوم تھا۔ اور والدہ کا نام بی بی آمنہ خاتون تھا۔ ان کا آبائی وطن موضع ریونڈھا ضلع دربھنگہ تھا اور نانیہال بنیار پور تھا جہاں آپ کی پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بنیار پور میں ہی ہوئی۔ سن شعور کو پہنچے تو چند سال ریونڈھا میں بھی رہے۔ لطف الرحمٰن بچپن سے ہی ذہین تھے اس لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کیا اور ڈبل ایم اے اور پی ایچ ڈی بھی کیا۔ یہاں تک کہ ایم اے میں گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔ انہوں نے اپنے تدریسی خدمات کا آغاز بھاگلپور یونی ورسٹی سے کیا اور صدر شعبۂ اردو بھاگلپور یونی ورسٹی کے عہدہ پر پہنچ کر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

لطف الرحمٰن کو سیاست سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ چنانچہ بھاگلپور اسمبلی حلقہ سے ایک بار قانون ساز اسمبلی کے لئے منتخب بھی ہوئے اور راشٹریہ جنتا دل سرکار میں کابینہ درجہ کے وزیر بھی ہوئے۔

آپ کو طالب علمی کے زمانے سے ہی مضامین نویسی اور شعروشاعری سے فطری دلچسپی تھی۔ تنقید، افسانہ نگاری اور شاعری آپ کے مخصوص موضوعات رہے ہیں۔ آپ کی شاعری کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ تازگی برگ نوا (مجموعہ غزل)، بوسۂ نم (مجموعہ غزل)، صنم آشنا (مجموعہ نظم)۔ ان کے علاوہ تنقید کے موضوع پر ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں جدیدیت کی جمالیات، نقد نگاہ، نثر کی شعریات، راسخ عظیم آبادی، تعبیر وتنقید اور شہر وفا وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شعری تخلیق اور دیگر تخلیقی عمل آج بھی جاری ہے۔

اردو ڈراما نگاری اور آغا حشر

اس مسلمہ حقیقت کے باوجود کہ آغا حشر کے بغیر اردو ڈرامے کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی، آغا حشر کی فن کارانہ شخصیت تضاد کا شکار رہی ہے۔ نقادوں کی ایک جماعت ان کو اردو کا شیکسپیئر اور دوسری عامیانہ اور سطحی مذاق کا تخلیق کار سمجھتی ہے۔ اس تضاد آرا کا بنیادی سبب اردو تنقید کی روایتی کج بینی تنگ نظری اور تعصب ہے یہ ایک معروضی سچائی ہے کہ آغا حشر کے نقادوں نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ احتشام حسین لکھتے ہیں:

'اگر وہ سستی شہرت سے بچ کر ڈرامے لکھتے اور زندگی کی انفرادی اور سماجی کشمکش کی بنیادوں پر اپنی ڈراما نگاری کی عمارت کھڑی کرتے ہیں تو حشر کا نقش تاریخ ادب پر اور گہرا ابھرتا ہے اور وہ ان نقائص کا شکار نہ ہوتے جو پارسی اسٹیج نے انہیں ورثے میں دیا'

وقار عظیم لکھتے ہیں:

'جس طرح یہ کمپنیاں بے شمار ہیں، اسی طرح ڈراما لکھنے والوں کی تعداد بھی انگنت ہے لیکن ان میں سے اکثر میں نہ صحیح ذوق ہے نہ صحیح علمی استعداد۔ اس لئے ڈراموں میں عموماً مذاق عام کی تسکین کی کوشش کی گئی ہے'

یہ دونوں رائیں انتہا پسندانہ ہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ آغا حشر کی فنکارانہ انفرادیت کا تجزیہ کرتے ہوئے ان نقادوں نے تخلیق کے زمانی پس منظر اور آغا حشر تک پہنچنے والی ڈراما کی روایت کو نظر انداز کر دیا۔

یہ ایک کائناتی صداقت ہے کہ ہر ادب اپنی عصری حسیت اور تہذیبی روایت کا آئینہ دار ہوتا ہے عظیم ادب کی ایک اہم پہچان یہ بھی ہے کہ وہ عصری حسیات و کیفیات کی تنقیدی آئینہ داری کے ساتھ ساتھ بعض ایسی صداقتوں کا عکاس بھی ہوتا ہے جو ماورائے عصر ہوتی ہیں یعنی ایسے ادب میں عصریت ابدیت سے ہم آہنگ ہوجاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ تخلیق کا زمانی و مکانی منظر و پس منظر سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے کسی بھی فنی تجربے کی عصری و ابدی

قدروں کا عرفان وشعور اس کی عصری حسیات اور تہذیبی اقدار کی بنیاد پر ہی ممکن ہے سنگ بنیاد کی اہمیت وحیثیت کو نظر انداز کر کے تنقیدی مطالعے کی دیوار تا ثریا بھی گئی تو کج ہی رہے گی۔ اردو تنقید نے آغا حشر کے مطالعہ میں اس کی کج روی کا ثبوت دیا ہے۔

آغا حشر کی فنی انفرادیت اور امتیاز کے تعین کے لئے اس حقیقت کو نظر انداز کرنا صحت مند تنقیدی رویہ نہیں ہوگا کہ آغا حشر کے قبل تک سنسکرت ڈراما نگاری کی مستحکم روایت کے باوجود اردو تمثیل نگاری فنی وفکری لحاظ سے معتبر و مستحکم نہ تھی یعنی اردو نے سنسکرت ڈراما نگاری کی دیرینہ عظیم الشان روایتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا حالانکہ سنسکرت سے فارسی اور اردو میں جمالیاتی روایت کی درآمد بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔

اس کے باوجود اردو تمثیل داستانی ماحول ومعاشرے اور روایات وجمالیات سے زیادہ متاثر رہی لکھنؤ کے شاہی اسٹیج اور عوامی اسٹیج کا غالب رجحان یہی تھا اس وقت کے اردو ڈراموں میں بالعموم پرستان کی فضا اور پریوں اور شاہزادوں کی تخیلی اور غیر ارضی کہانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ مکالموں میں پرتکلف مقفیٰ اور مسجع زبان کا التزام کیا جاتا تھا۔ مکالموں کے درمیان گیت اور غزل کی کثرت ہوتی تھی ڈراما کا بنیادی مقصد عوامی ذوق کی تسکین اور حصول زر تھا۔ ڈراما نگاری کی حد تک تفنن طبع کو حاصل فن سمجھا جاتا تھا۔

فن کے جمالیاتی تقاضوں کی تکمیل کا بنیادی مقصد بے خبری کا شکار تھا جیسا کہ فی زمانہ فلموں کا حال ہے بنیادی مقصد سستی فلموں کے ذریعہ عوام الناس کے ذوق کی تکمیل اور تجارت اور منافع کا حصول ہے۔ اس مقصد کے لئے ہندوستان کی دیرینہ تہذیبی اور ثقافتی قدروں کو فیشن پرستی، ادیت پسندی اور جدت پسندی کے نام پر قربان کیا جارہا ہے جس کی انتہا کسی بھی عام فلم میں دیکھی جاسکتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان فلموں کو حقیقی زندگی سے دور کا بھی رابطہ و واسطہ نہیں ہے۔ مگر حصول زر کے لئے ایسی فلمیں بنے بنائے فارمولوں کے تحت تیزی کے ساتھ ڈھل رہی ہیں۔ آغا حشر کے زمانے میں بھی ڈراما کمپنیوں کا مقصد حصول زر اور تجارت تھا۔

آغا حشر کی ڈراما نگاری کا آغاز 1901ء میں ہوا۔ ان کے بہت قبل سرسید کی علی گڑھ تحریک پوری طاقت و توانائی کے ساتھ سامنے آچکی تھی۔ حالی، شبلی، محسن الملک اور وقار الملک کی کوششوں کی بنا پر ایک نئے سماج اور معاشرے کی تشکیل کی کوششوں کو مقبولیت حاصل ہورہی تھی۔ اور نئی تعلیم کی تحریک برگ و بار لارہی تھی۔ ادب میں بھی انقلاب آچکا تھا۔ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر ادب کا سماجی اور معاشرتی رشتہ وتعلق سامنے آچکا تھا۔ ادب کے

سماجی کردار کا احساس عام ہو رہا تھا۔ ایسی تخلیقات سامنے آ رہی تھیں جو سماج اور معاشرے کی نئی روایتوں کی تشکیل و تعمیر کر رہی تھیں۔ یعنی جدید ادب و شاعری کی بوطیقا زیر تحریر تھی۔ لیکن اردو ڈراما نگاری اپنی پرانی ڈگر پر سفر طے کرتی رہی۔

یہ درست ہے کہ آغا حشر کے قبل طالب بنارسی، بیتاب دہلوی اور احسن لکھنوی نے ڈراموں میں کچھ تبدیلیاں کی تھیں لیکن یہ تبدیلیاں بھی عوامی پسند اور ناپسند کو ملحوظ رکھ کر کی گئی تھیں۔ آغا حشر بھی اپنے ابتدائی دور میں اپنے پیش رووں کی روایت سے گہرے طور پر متاثر رہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ دوران کی مشق و ممارست کا دور تھا۔ وہ ناٹک اور اسٹیج کی دنیا میں نووارد تھے۔ مگر جلد ہی ان کی ریاضت اور مشق و ممارست نے انہیں منفرد تخلیقی شعور کا حامل بنا دیا۔ چنانچہ انہوں نے بنی بنائی ڈگر سے انحراف کیا۔

آغا حشر پہلے ڈراما نگار ہیں جنہوں نے سب سے پہلے عصری زندگی کی حقیقتوں کو موضوع فن کی حیثیت دی اپنے ڈراموں میں سماجی اور معاشرتی مسائل کو جگہ دی۔ جدید اردو ادب و شاعری میں جو اولیت حسین آزادی، حالی اور شبلی کو ہے وہی اولیت اردو ڈرامہ نگاری میں آغا حشر کو ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اردو میں جدید ڈراما نگاری آغا حشر سے شروع ہوئی۔

آغا حشر کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے مقفیٰ اور مسجع اسلوب اور عبارت آرائی کی جگہ عوامی گفتگو اور لب ولہجہ کو عام کرنے کی روایت قائم کی۔ ڈرامے کی زبان کو اردو نثر کی ارتقائی تحریک و تاریخ سے ہم آہنگ کر کے اردو ڈراما نگاری کے اسلوب میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ غزلوں اور گیتوں کے حد سے زیادہ استعمال میں اعتدال و توازن پیدا کیا۔ اردو ڈرامے کی زبان کو عصری نثری اسلوب سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ آغا حشر کا یہ اقدام اپنے سے قبل ڈراما نگاری کی روایت سے بغاوت کے مترادف تھا۔

آغا حشر کے ڈراموں میں اسیر حرص، شہید ناز، مار آستین، صید ہوس، خواب ہستی، خوبصورت بلا، یہودی کی لڑکی، رستم و سہراب، اور سلور کنگ وغیرہ سے ان کے منفرد اسلوب اور نثری روایت کا بخوبی اندازہ ممکن ہے۔ خاص طور پر 'سلور کنگ' اور 'رستم و سہراب' میں آغا حشر کی مذکورہ بالا خصوصیتیں زیادہ روشن ہیں۔ ان ڈراموں میں عصری زندگی کے آزار و کوائف کی بھرپور آئینہ داری ہوئی ہے۔ زبان و اسلوب میں بھی جدت و ندرت موجود ہے۔

آغا حشر اردو ڈرامہ نگاری کی تاریخ میں صف اول کے فنکار ہیں۔ ان کے بعد اسٹیج ڈراموں کا فن تقریباً

پس پشت پڑ گیا اور ادبی ڈراموں کا آغاز ہوا۔ پھر فلم کی ایجاد و مقبولیت نے اردو ڈرامہ نگاری کی روایت پر بے حد منفی اثرات ڈالے لیکن عصر حاضر میں بعض اہم ڈراما نگار سامنے آئے ہیں۔

اسٹیج ڈراما نگاری کی روایت کو مقبول عام بنانے اور استحکام بخشنے والوں میں آغا حشر صف اول کے فنکار ہیں۔ اردو ڈراما کو موضوع، فن اور اسلوب کی سطح پر انہوں نے ترفع سے ہم کنار کیا اور عصری زندگی اور معاشرتی تقاضوں اور عوامی شعور کی بیداری اور آزادی و انقلاب کی تحریک کو فعال اور دو آتشہ بنانے میں لازوال حصہ لیا۔ وہ اردو ڈرامے کے شیکسپیئر ہیں کہ نہیں اسے قطع نظر پریم چند اور اقبال سے کسی بھی طرح ان کا تخلیقی مرتبہ کم نہیں ہے۔

لفظ و معنی

اظہار خیال	۔	اپنے خیالات اور نظریات کو واضح کرنا
واضح	۔	کھلا، صاف
اردو کا شیکسپیئر	۔	شیکسپیئر انگریزی ادب کا ماہر ڈرامہ نگار تھا اس کی نسبت سے
عامیانہ	۔	سطحی، بہت اعلیٰ نہیں، معمولی
مقبول	۔	ہر دل عزیز، سب کا پسندیدہ
عکاس	۔	تصویر بنانا، آئینہ دکھانا، سچ سچ بیان کر دینا
روایت	۔	تاریخ، پچھلے واقعات اور حع ن ی روشنی میں س کو جانچنا
جرأت	۔	ہمت، کوشش
منفی اثرات	۔	وہ اثرات جس کے اثرات صحیح رجحان نہیں رکھتے، غلط مقصد
قوم پرستی	۔	اپنی قوم کی خدمات کا خیال رکھنا، قوم کا بھلا چاہنے والا

آپ نے پڑھا

- لطف الرحمٰن نے اپنے اس تنقیدی مضمون 'اردو ڈراما نگاری اور آغا حشر' پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس بات کی طرف واضح اشارے کیے ہیں کہ اب تک ان کو اردو کا شیکسپیئر اور دوسری طرف عامیانہ اور سطحی مذاق کا تخلیق کار

سمجھا جاتا رہا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر بہر حال ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ ڈراما لکھنے والوں اور انہیں منظرعام میں مقبول بنانے کی تمام کوششوں میں ایک طرف انہوں نے اتنی عجلت دکھائی کہ وہ ایک خاص سطح کے فنکار بن کر رہ گئے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ سنیما ہو یا ڈراما اور افسانہ وہ زمانے کا عکاس ہوتا ہے جس میں وہ لکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں زمانی اور مکانی حدود سے آگے کے بھی بہت سارے نکات چھپے ہوتے ہیں۔

- آغا حشر کے سامنے سنسکرت ڈراما کی طویل روایت رہی ہے۔ مگر اس سے لوگوں نے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ ان کے یہاں واحد مقصد تفنن طبع اور ذوق ادب کی تسکین ہی تھا۔ اسی وجہ سے اس میں فارمولا فلموں کی طرح دلچسپی کے عناصر پر خاص توجہ دی جاتی رہی۔

مختصر ترین سوالات

1. لطف الرحمٰن کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
2. لطف الرحمٰن کس پارٹی کے وزیر اور ایم ایل اے رہے؟
3. لطف الرحمٰن کی کسی دو کتاب کا نام لکھئے۔
4. آغا حشر کے کسی ایک ڈراما کا نام لکھئے۔
5. ڈراما کی تکمیل کا لازمی عنصر کیا ہے؟

مختصر سوالات

1. لطف الرحمٰن کی زندگی کے بارے میں پانچ جملے لکھئے۔
2. مضمون نگاری کی مختصر تعریف لکھئے۔
3. تنقید کے بارے میں پانچ جملے لکھئے۔
4. ڈراما کی مختصر تعریف لکھئے۔
5. آغا حشر کشمیری کی ڈراما نگاری پر پانچ جملے لکھئے۔

طویل سوالات

1. لطف الرحمٰن کی تنقید نگاری پر ایک مضمون لکھئے۔
2. آغا حشر کشمیری کی ڈراما نگاری پر روشنی ڈالئے۔

3. اردو میں تنقید کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالئے۔
4. اسم کی تعریف کیجئے اور اس کے اقسام بیان کیجئے۔

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے اردو کے معیاری ڈراموں کی ایک فہرست بنایئے۔
2. تنقید کے موضوع پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک مذاکرہ کیجئے۔

آریہ بھٹ اور تریگنا

آریہ بھٹ : ہندوستان کے عہد قدیم کی تاریخ میں گپت دور کو سنہرا دور کہتے ہیں۔ اس دور کے حکمراں علم دوست اور انصاف پسند تھے۔ اس دور میں بڑے بڑے سائنس داں بھی تھے۔ آریہ بھٹ جیسے عظیم سائنس داں کا تعلق اسی دور سے تھا۔ وہ اپنے وقت کا عظیم ماہر علم نجوم، علم ریاضی اور علم الجبر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مشہور ماہر علم ریاضی پائتھا گورس کی رہنمائی آریہ بھٹ نے ہی کی تھی۔

آریہ بھٹ کی جائے پیدائش کے بارے میں حتمی طور پر تو کچھ کہنا مشکل ہے لیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ پٹنہ کے مغرب میں کھگول میں اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ کھگول کے معنی علم نجوم سے ہوتا ہے اور آریہ بھٹ کا تعلق علم نجوم سے تھا۔ اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ کھگول ہی آریہ بھٹ کی جائے پیدائش ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش 476ء ہے اور 564ء میں 88 سال کی عمر میں اس کی وفات ہوگئی۔

آریہ بھٹ کے خدمات : وہ گپت عہد حکومت کا نہ صرف یہ کہ ماہر علم ریاضی تھا بلکہ علم نجوم کے میدان میں بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ موجودہ دور کے سائنس داں آج بھی حیرت زدہ ہیں کہ ڈیڑھ ہزار سال قبل کے ایک سائنس داں نے علم نجوم کے ایسے اصول وضع کئے جو آج بھی سائنس دانوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ سائنس کے محققین لکھتے ہیں کہ آریہ بھٹ نے پٹنہ شہر سے تیس کیلو میٹر جنوب میں مسوڑھی کے نزدیک تریگنا میں اپنے تحقیقی کاموں کے لئے ایک تجربہ گاہ قائم کیا تھا۔ اور تریگنا میں ہی بیٹھ کر آریہ بھٹ نے اپنے مشہور تصنیف 'آریہ سدھانت اور تنتر' کو لکھا تھا۔ وہ دنیا کا پہلا سائنس داں تھا جس نے اپنی تحقیقات سے ثابت کیا کہ زمین گول ہے اور اپنے محور پر گھومتے ہوئے سورج کی گردش کرتی ہے۔ چنانچہ اس سائنس داں نے سب سے پہلے سورج گرہن اور چاند گرہن کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرائیں۔

آج علم ریاضی میں عالمی سطح پر نظام اعشاریہ (Dismal System) کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا

جاسکتا۔ بلکہ سائنس کے تمام شعبوں میں نظام اعشاریہ کی اہمیت مسلم ہے۔ سائنسی تحقیق کا یہ عظیم کارنامہ آریہ بھٹ جیسے سائنس داں نے انجام دیا۔

کہا جاتا ہے کہ علم ریاضی میں صفر کا تصور آریہ بھٹ نے ہی پیش کیا تھا۔ علم نجوم کے تعلق سے بھی آریہ بھٹ کی کئی اہم تحقیقات ہیں۔ چنانچہ موجودہ دور کے سائنس داں بھی سورج گرہن 2009ء کو دیکھنے کے لئے صحیح جگہ کی تلاش وجستجو آریہ بھٹ کی کتابوں کے مطالعہ سے ہی کیا۔ چنانچہ آریہ بھٹ کی کتاب میں اس نظام شمسی کے سیاروں کی گردش، دوری اور مختلف تاروں کے حرکات وسکنات پر عجیب وغریب معلومات موجود ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ آریہ بھٹ کی سائنسی تحقیقات پر ازسرنو تحقیق کی جائے تاکہ اس کے اہم سائنسی ایجادات سے آج کی دنیا روشناس ہوسکے۔ اسی عظیم سائنس داں نے سورج کے تعلق سے یہ مسلمہ اصول پیش کیا کہ ہماری زمین سورج کا طواف کرتی ہے اور سورج اپنے آپ میں ساکت ہے۔

سورج گرہن : کسی سیارہ یا ستارہ پر جزوی یا مکمل طور پر پردہ پڑ جانے کو گرہن کہتے ہیں۔ ہم زمین کے باشندوں کو دو طرح کے گرہن سے واسطہ پڑتا ہے۔ سورج گرہن (Solar Eclipse) اور چاند گرہن (Luner Eclipse)۔ یہ گرہن اس وقت واقع ہوتے ہیں جب ایک سیارہ یا ستارہ کسی دوسرے سیارے یا ستارے پر اپنا سایہ ڈالتا ہے۔

چونکہ چاند زمین کا طواف کرتا ہے اور زمین سورج کا طواف کرتی ہے اسی لئے چاند اور زمین کے اس طواف کے دوران چاند کا زمین اور سورج کے درمیان آجانا لازمی امر ہے۔ ایسی صورت میں چاند کا جزوی یا مکمل سایہ سورج پر پڑتا ہے اور سورج کی روشنی زمین پر آنے میں مزاحمت پیدا کرتی ہے جس کے نتیجے میں سورج گرہن ہوتا ہے۔ جزوی سورج گرہن اور مکمل سورج گرہن اس بات پر منحصر کرتا ہے کہ چاند اپنا سایہ سورج پر کس طرح اور کس زاویئے سے ڈالتا ہے یعنی جزوی سایہ ڈالنے پر جزوی سورج گرہن ہوتا ہے اور کلی سایہ ڈالنے پر مکمل سورج گرہن ہوتا ہے۔ لیکن اتنی بات طے ہے کہ مکمل سورج گرہن سو سال کی طویل مدت کے بعد ہی ہوتا ہے۔ سورج گرہن ایک جغرافیائی واقعہ ہے جو تاریخ کے ابتدائی دور سے ہی ہوتا آرہا ہے اور انسان اسے ننگی آنکھوں سے دیکھتے آئے ہیں۔ لیکن آج بھی سورج گرہن کا واقعہ انسانوں کے لئے تجسس کا موضوع بنا ہوا ہے۔

تریگنا کی جغرافیائی اہمیت : تریگنا پٹنہ سے دکھن جانب ۳۰ کیلومیٹر کی دوری پر مسوڑھی سب ڈویژن میں واقع ہے۔ اور اسی مناسبت سے پٹنہ گیا ریلوے لائن میں مسوڑھی اسٹیشن کا نام تریگنا رکھا گیا ہے۔ مسوڑھی اسٹیشن سے محلہ رحمت گنج تک بشمول سب ڈویژن کے تمام سرکاری دفاتر تریگنا کے ہی حلقہ میں آتے ہیں یعنی تریگنا کا علاقہ پچھم میں سون ندی اور پورب میں پن پن ندی تک پھیلا ہوا ہے۔ تریگنا کے محل وقوع کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہاں سالوں بھر آسمان میں فضا صاف رہتی ہے۔ یہاں سے تاروں، سیاروں اور مکمل نظام شمسی کی تحقیق کرنا نسبتاً آسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آریہ بھٹ نے اپنے جغرافیائی تحقیق کے لئے اس مقام کو منتخب کیا اور وہاں اپنے تحقیق کے لئے ایک تجربہ گاہ بنایا۔ تریگنا ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی 'تارے گننا' کے ہوتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اس مقام کا نام تریگنا رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ آریہ بھٹ نے ساٹھ فٹ کی بلندی کا ایک ٹیلہ بنایا جس پر بیٹھ کر وہ رات کو تاروں اور سیاروں کے بارے میں تحقیقی کام کیا کرتا تھا۔ نظام شمسی کی رفتار، سورج گرہن اور چاند گرہن کے بارے میں تفصیلی معلومات آریہ بھٹ نے تریگنا میں ہی حاصل کئے۔ اپنی تحقیقات کے نتائج کو اس نے اپنی ایک کتاب میں تحریر کئے جو آج کے سائنس دانوں کے لئے رہنمائی کا کام کرتی ہے۔

2009۔ کا سورج گرہن اور تریگنا : اکیسویں صدی کا سب سے بڑا سورج گرہن 22 رجولائی 2009ء کو پیش آیا۔ اس سورج گرہن کی اہمیت اس لئے بڑھ گئی کہ ایسا سورج گرہن ایک صدی کے بعد ہی واقع ہوتا ہے۔ امریکہ کے سائنسی تحقیقی ادارہ ناسا (NASA) کے ایک سائنس داں جے اینڈرسن جو گزشتہ بیس سالوں سے 2009ء میں پیش آنے والے اس سورج گرہن پر تحقیقی کام کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے 2008ء میں 200 صفحات پر مشتمل ایک تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں انہوں نے واضح کیا کہ اس سورج گرہن کے مشاہدہ کے لئے مناسب ترین مقام تریگنا ہے۔ پھر کیا تھا تریگنا کو عالمی سطح پر شہرت حاصل ہوگئی۔ اس کی وجہ سے 1500 سو سال قبل کے تریگنا میں آریہ بھٹ کے تجربہ گاہ کی تاریخ زندہ ہوگئی۔

جولائی 2009ء کے پورے مہینہ میں ملکی اور غیر ملکی اخبارات اور ذرائع ابلاغ میں تریگنا کو نمایاں مقام حاصل ہوگیا۔ 22 رجولائی کی تاریخ قریب آتی گئی اور تریگنا سے متعلق ساری دنیا کا تجسس بڑھتا چلا گیا۔ ناسا رپورٹ میں جے اینڈرسن (J. Anderson) نے تریگنا کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہاں بادل

چھانے کا اوسط امکان بہت کم ہے اور دھوپ کی تمازت بھی دوسرے شہروں کے مقابلہ میں 43 فیصد زیادہ ہے۔ اس صورت میں سورج گرہن کے نظارے اور مشاہدہ کے لئے تریکنا مناسب ترین مقام ہے۔

22 رجولائی 2009ء کے اس سورج گرہن کا مشاہدہ کرنے کے لئے ملک اور بیرون ملک کے سائنس داں بہار کی راجدھانی پٹنہ پہنچنے لگے۔ یہاں تک کہ امریکہ کے ناسا اور اسرو جیسے سائنسی تحقیقی اداروں کے سائنس دانوں کی ٹیم بھی وہاں پہنچ گئی۔ پولینڈ کے سائنس دانوں کی ایک ٹیم بھی گئی۔ دہلی اور نینی تال کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سائنس دانوں کی جماعت 21 رجولائی کو تریکنا پہنچ گئی۔ حکومت بہار نے اپنے تمام اعلیٰ افسروں کو نظم ونسق سنبھالنے کے لئے تریکنا بھیج دیا۔ تریکنا اسپتال کی نئی عمارت کو سائنس دانوں کے مشاہدے کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ چھت کے اوپر مختلف قسم کے آلات نصب کئے گئے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں عام لوگ رات میں ہی پٹنہ سے تریکنا آچکے تھے۔ 22 رجولائی کو سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی انتظار کی گھڑی ختم ہونے والی تھی جب سارا سورج چاند کے لپیٹ میں آنے والا تھا اور سورج کے اوپری کنارے کا وہ حصہ جو ہیرے کی انگوٹھی کی شکل میں ہوگا، روشن دکھائی دینے والا تھا۔ ہزاروں لوگوں کی آنکھوں پر سورج گرہن دیکھنے کے لئے ایک خاص قسم کے چشمے لگے ہوئے تھے۔ لوگوں کا تجسس رفتہ رفتہ بڑھتا جارہا تھا لیکن افسوس کہ تریکنا کا آسمان اچانک ابر آلود ہوگیا بارش کے قطرات بھی گرنے لگے۔ صبح 5 بج کر 29 منٹ اور 58 سکنڈ کا وہ لمحہ آہی گیا جس کا ساری دنیا کو شدت سے انتظار تھا۔ لیکن انسان کی ساری تیاریوں نے نظام قدرت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اس کے باوجود لوگوں نے ایک عجیب وغریب ماحول کا نظارہ کیا۔ ایسا لگا کہ رات واپس ہوگئی اور ہر طرف گھنا اندھیرا چھا گیا۔ ان لمحات میں جانور سہمے ہوئے نظر آئے۔ پرندے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹتے نظر آئے اور مشرق کی جانب آسمان میں تارے بھی نظر آئے اور درجہ حرارت میں کمی کا احساس بھی ہوا۔

'ہیرے کا چھلہ' دیکھنے کی تمنا لئے ملک اور بیرون ملک کے سائنس داں واپس ہونے لگے اور اب اس چھلہ کو دیکھنے کے لئے دنیا کو 123 سالوں تک انتظار کرنا پڑے گا۔ دن میں مکمل تاریکی اور ایک عجیب وغریب خاموش منظر اور ہزاروں ہزار افراد کا ہجوم تریکنا کے لئے اب ایک ناقابل فراموش تاریخی واقعہ بن گیا ہے۔

ماخوذ

لفظ و معنی

عہد	۔	زمانہ
قدیم	۔	بہت پرانا
علم دوست	۔	علم سے دلچسپی رکھنے والے
انصاف پسند	۔	انصاف کرنے والے
سائنس داں	۔	علم سائنس کا ماہر
علم ریاضی	۔	علم الحساب
پائتھا گورس	۔	ایک مشہور سائنس داں کا نام
علم نجوم	۔	ستاروں سے متعلق علم
آریہ بھٹ	۔	ہندوستان کے ایک مشہور سائنس داں کا نام
وضع کرنا	۔	ایجاد کرنا
محقق	۔	تحقیق کرنے والے
تجربہ گاہ	۔	سائنسی تجربوں کا مرکز
محور	۔	دھوری
گردش کرنا	۔	گھومنا
افادیت	۔	فائدہ، فائدے کا اندازہ
شعبہ	۔	گوشہ۔ تعلیم کا محدود حلقہ
جستجو	۔	تلاش
نظام شمسی	۔	سورج اور اس کے اردگرد گردش کرنے والے سیاروں کا مجموعہ
جزو	۔	تھوڑا، ٹکڑا
امر	۔	معاملہ
طواف	۔	کسی چیز کے چاروں طرف گھومنا
ازسرنو	۔	نئے سرے سے

آپ نے پڑھا

- ہندوستان کی قدیم تاریخ میں گپت دور کو ہندوستان کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور کے حکمراں نہ صرف یہ کہ علم دوست اور انصاف پسند تھے بلکہ عالموں اور سائنس دانوں کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔
- آریہ بھٹ جیسے عظیم سائنس داں کا تعلق گپت دور سے تھا اور صوبہ بہار کو اس عظیم سائنس داں کی جائے پیدائش ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آریہ بھٹ ایک عظیم سائنس داں ہونے کے علاوہ ماہر نجوم، علم ریاضی اور علم الجبر تھا۔ مشہور ماہر علم ریاضی پائتھا گورس کی رہنمائی آریہ بھٹ نے ہی کی تھی۔
- آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل آریہ بھٹ نے علم نجوم کے ایسے اصول وضع کئے تھے کہ جن کو دیکھ کر آج کے سائنس داں حیرت زدہ ہیں۔ یہ اصول آج بھی سائنس دانوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔
- آریہ بھٹ نے پٹنہ سے بیس کیلو میٹر جنوب میں مسوڑھی کے پاس تریکنا میں اپنے تحقیقی کاموں کے لئے ایک تجربہ گاہ قائم کیا تھا۔ اور وہیں بیٹھ کر اس نے سائنس کے موضوع پر 'آریہ سدھانت اور تنتر' نام کی ایک کتاب لکھی اور پہلی بار یہ ثابت کیا کہ زمین گول ہے اور یہ اپنے محور پر گھومتے ہوئے سورج کی گردش کرتی ہے۔
- سورج گرہن اور چاند گرہن کے بارے میں آریہ بھٹ نے تفصیلی معلومات فراہم کرائیں۔ کسی سیارہ یا ستارہ پر جزوی یا مکمل طور پر پردہ پڑ جانے کو گرہن کہتے ہیں۔ ہم زمین کے باشندے کو دو طرح کے گرہن سے واسطہ پڑتا ہے۔ سورج گرہن (Solar Eclipse) اور چاند گرہن (Luner Eclipse)۔ یہ گرہن اس وقت واقع ہوتے ہیں جب ایک سیارہ یا ستارہ کسی دوسرے سیارے اور ستارے پر اپنا سایہ ڈالتا ہے۔

معروضی سوالات

1. آریہ بھٹ کی پیدائش کہاں ہوئی۔

(الف) بہار (ب) جھارکھنڈ (ج) اڑیسہ (د) آسام

2. آریہ بھٹ نے اپنا تجربہ گاہ کہاں قائم کیا؟

(الف) گیا (ب) تریکنا (ج) پٹنہ (د) کھگول

3. ہندوستان میں گپت عہد کو کیسا دور کہا جاتا ہے؟

(الف) جمہوری دور (ب) ترقی پسند دور (ج) سنہرا دور (د) تاریک دور

4. آریہ بھٹ کا تعلق کس عہد سے تھا؟

(الف) گپت عہد (ب) مغلیہ عہد (ج) موریہ عہد (د) برٹش عہد

5. آریہ بھٹ نے کس سائنس داں کی رہنمائی کی تھی؟

(الف) گیلیلیو (ب) پائتھوگورس (ج) ٹامس ایڈیسن (د) ابوالکلام

مختصر سوالات

1. سورج گرہن اور چاند گرہن کا مختصر تعارف پیش کیجئے۔
2. آریہ بھٹ کی جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش پر روشنی ڈالئے۔
3. تریکنا کے محل وقوع پر پانچ جملے لکھئے۔
4. کیا سورج گرہن کو ننگی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟
5. 2009ء کے سورج گرہن کی اہمیت بیان کیجئے۔

طویل سوالات

1. سورج گرہن اور چاند گرہن کے اسباب پر تفصیلی روشنی ڈالئے۔
2. آریہ بھٹ کے سائنسی کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیجئے۔

آیئے، کچھ کریں

1. سورج، چاند اور زمین کی تصویر بنا کر گرہن کو دکھائیں۔
2. کلاس گلوب کی مدد سے زمین کی گردش کو معلوم کریں۔
3. آریہ بھٹ کے سائنسی ایجادات اور کارناموں کا ایک چارٹ بنائیں۔
4. سورج گرہن اور چاند گرہن کے موضوع پر کلاس میں ایک مذاکرہ کریں۔

ناول

اردو کی نثری ادب میں ناول ایک اہم شاخ ہے۔ ناول کے فن کے ذریعہ ہماری زندگی، ماحول اور روز مرہ کے معاملات کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ صنف مغربی ادب کی دین ہے۔ برطانیہ کی ایک خاتون ادیبہ کلارا ریوز نے ناول کی تعریف اس طرح کی ہے: 'ناول اس زمانے کی زندگی اور معاشرت کی سچی تصویر ہے جس زمانے میں وہ لکھا جائے۔' گویا ناول نگاری کا مقصد حقیقی زندگی اور اس کے ماحول کی ترجمانی سچے طور پر کرنا ہے۔

فنی اعتبار سے پلاٹ، کردار، ماحول، مکالمہ، جذبات نگاری، فلسفۂ حیات، زبان وغیرہ ناول کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

مغربی ممالک میں صنعتی انقلاب کے بعد ناول نگاری کی ابتدائی کوششیں شروع ہوگئی تھیں اور کچھ ہی مدت میں ناول نگاروں کی ایک جماعت تیار ہوگئی جن کی کوششوں سے صنف ناول کو اعتبار حاصل ہوگیا۔

اردو ناول کو فروغ دینے والوں میں ڈپٹی نذیر احمد کا نام سرِ فہرست ہے۔ انہوں نے 'مراۃ العروس' کے عنوان سے قصے کی ایک ایسی کتاب لکھی جسے بعد کے زمانے میں اردو کا پہلا ناول قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نذیر احمد نے چھ ناول لکھے ان تمام ناول کے قصوں کا مقصد قوم کی زبوں حالی اور اصلاح معاشرہ ہے۔ شاد عظیم آبادی کا ناول 'صورۃ الخیال'، حالی کے 'مجالس النساء'، رشیدۃ النساء اور 'اصلاح النساء' وغیرہ میں بھی کم وبیش نذیر احمد کی تقلید ہے۔ اسی زمانے میں عبدالحلیم شرر اور پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ناول نگاری کا ایک الگ نگار خانہ سجایا۔ شرر تاریخ کے پردے میں اپنی باتیں کہتے ہیں جبکہ سرشار تہذیب وثقافت اور قدروں کو اپنے ناول کی بنیاد بناتے ہیں۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں اردو ناول کے نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ مرزا ہادی رسوا 'امراؤ جان' لے کر منظر عام پر آئے۔ ناول کے فن اور تکنیک کے اعتبار سے مرزا ہادی رسوا نے جس عہد جدید کا خاکہ کھینچا اس کا عروج پریم چند کے ناولوں میں نظر آتا ہے۔ 'گئودان' سے 'میدان عمل' تک پریم چند کے پندرہ ناول اس کے عمدہ نمونے ہیں۔

پریم چند کے بعد ترقی پسند ناول نگاروں میں سجاد ظہیر کا ناول 'لندن کی ایک رات' ہے۔ کرشن چندر اور عصمت چغتائی ترقی پسندوں میں خاصے مقبول ناول نگار ہیں۔ ناول کا سفر مسلسل جاری ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد

نذیر احمد کی پیدائش 6 ردسمبر 1836ء کو ضلع بجنور کے افضل گڑھ پرگنہ کی بستی کوریٹر میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سعادت علی تھا۔ نذیر احمد کا نسبی سلسلہ ایک بزرگ عبدالغفور اعظم پوری سے ملتا ہے جو شاہ عبدالقدوس گنگوہی کے مشہور خلفاء میں تھے۔ ان کے نانا قاضی غلام علی شاہ کا شمار بھی اپنے وقت کے بڑے بزرگوں میں ہوتا تھا۔

نذیر احمد کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں ہوئی۔ اپنے والد سعادت علی سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی اور مولوی نصر اللہ سے بھی عربی کی معیاری کتابوں کی تعلیم حاصل کی۔ پھر نذیر احمد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے دہلی گئے۔ پرنسپل کارگل کے توسط سے 1845ء میں دہلی کالج میں داخل ہوئے اور 1853ء تک دہلی میں مقیم رہے۔ اسی دوران مولوی عبدالخالق کی پوتی سے ان کی شادی ہوگئی۔ 13 سال کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ شادی کے بعد فکر معاش دامن گیر ہوئی وہ حصول معاش کے لئے پنجاب گئے اور ٹیمپل صاحب میں چالیس روپیہ ماہوار پر معلمی کے فرائض انجام دینے لگے۔ اس ملازمت سے وہ مطمئن نہیں تھے اس لئے استعفیٰ دے دیا اور کانپور میں مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر ہوگئے۔ لیکن ناموافق حالات کے نتیجہ میں یہاں بھی استعفیٰ دینا پڑا۔ اسی دوران غدر 1857ء کا واقعہ پیش آیا۔ کسی طرح دہلی آگئے اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے۔

ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا اولین ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ مراۃ العروس کی اشاعت 1869ء میں ہوئی۔ اس ناول کے دو کردار اکبری اور اصغری اب بھی زندہ کردار ہیں۔ اس کے بعد 1872ء میں ان کا ناول 'بنات النعش' شائع ہوا۔ اس ناول میں تعلیم پر خاصا زور دیا گیا ہے۔ اس کا ایک کردار اصغری خانم تعلیم نسواں کو عام کرتی ہیں۔ توبتہ النصوح کی اشاعت 1877ء میں ہوئی۔ فنی اعتبار سے توبتہ النصوح قدرے بہتر ہے۔ نصوح عالم خواب میں حشر کا نقشہ دیکھتا ہے۔ یہی خواب اس کی زندگی میں اصلاحی انقلاب کا باعث ہوتا ہے۔ فسانہ مبتلا 1885ء میں شائع ہوا۔ ابن الوقت نذیر احمد کے ناولوں میں سب سے اہم ہے۔ نذیر احمد کا آخری ناول رویائے صادقہ ہے جو 1884ء میں شائع ہوا۔ نذیر احمد کے ناولوں کے دوررس اثرات مرتب ہوئے اس حد تک کہ ہر علاقے میں اس نوعیت کی اصلاحی تحریریں مسلسل لکھی جانے لگیں۔ اپنی تصانیف کے ذریعہ نذیر احمد نے اردو ناول کے لئے ایک میدان تیار کردیا۔ 74 سال کی عمر میں نذیر احمد پر فالج کا اثر ہوا۔ اور 28 ردسمبر 1910ء میں ان کا وصال ہوگیا۔

فہمیدہ اور منجھلی بیٹی حمیدہ کی گفتگو

فہمیدہ: تم کو جواب چند روز سے نماز پڑھتے دیکھتی ہوں تو پرسوں مجھ سے پوچھنے لگی کہ اما جان دن میں کئی مرتبہ ابا جان ہاتھ منہ دھو کر یہ کیا کیا کرتے ہیں۔ پہلے دیر تک بڑے ادب سے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ چپکے چپکے کچھ باتیں کرتے ہیں پھر جھکتے ہیں پھر منہ کے بل گر پڑتے ہیں۔

میں: بیٹی نماز پڑھتے ہیں۔

حمیدہ: اما جان نماز کیا۔ نماز کو اس استعجاب کے ساتھ پوچھنا یہ پہلی چٹکی تھی کہ اس نے میرے دل میں لی۔

میں: بیٹی خدا کی عبادت کو نماز کہتے ہیں۔

حمیدہ: اما جان خدا کیا چیز ہے اور عبادت اس کی کون ہے۔ اس کا بھولے پن سے یہ پوچھنا تھا کہ خدا کیا چیز ہے اور عبادت اس کی کون ہے کہ میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

میں: کیوں کیا تم خدا کو نہیں جانتیں۔

حمیدہ: میں سب لوگوں کو خدا کی قسم کھاتے تو سنتی ہوں اور جب کبھی اما جان تم خفا ہوتی ہو تو کہا کرتی ہو خدا کی مار اور تجھے خدا سمجھے شاید خدا بیجا کو کہتے ہیں مگر بیجا ہوتی تو اس کی قسم نہ کھاتے۔

میں: حمیدہ توبہ کرو توبہ خدا بیجا نہیں ہے خدا وہ ہے جس نے ہم سب کو پیدا کیا ہے وہی روزی دیتا ہے وہی مارتا ہے وہی جلاتا ہے وہی پالتا ہے۔ حمیدہ۔ کیا ابا جان تم کو بھی خدا ہی نے پیدا کیا ہے۔

میں: ہاں مجھ کو بھی۔

حمیدہ: اور ابا جان کو بھی۔

میں: ہاں تمہارے ابا جان کو بھی۔

حمیدہ: اور نئی بوا کو بھی۔

میں: ہاں نئی بوا کو بھی۔

حمیدہ: اما جان کیا ہر روز ہمارے گھر میں کھانا نہیں پکتا۔

میں: کیوں نہیں پکتا۔

حمیدہ: پھر تم تو کہتی ہو کہ خدا سب کو کھانے کو دیتا ہے۔

میں: اللہ میاں پانی برساتے ہیں۔ اللہ میاں غلے اور میوہ اور ترکاریاں ہم لوگوں کے واسطے زمین میں اگاتے ہیں وہی ہم سب لوگ کھاتے ہیں۔

حمیدہ: نئی بوا کو تو اما جان تم دودھ پلاتی ہو۔

میں: دودھ بھی اللہ میاں ہی اتارتے ہیں۔ تمہاری ہی دفعہ اسی دودھ کے پیچھے برسوں مصیبت اٹھائی۔ چھٹی تک الغارون دودھ تھا چھٹی نہا کر اٹھی کہ یکا یک جاڑا چڑھا بخار آیا تو کس شدت کا کہ الامان تمام بدن سے آنچ نکلتی تھی۔ وہ پہر بھر کا بخار آنا اور دودھ کا تاؤ کھا جانا پھر بہتری ستاول پھانکی زیرہ پیا حکیم کا علاج کیا تمہارے دادا جان خدا جنت نصیب کرے ہر روز صبح کو تشتری لکھ دیا کرتے تھے مگر دودھ کچھ ایسی گھڑی کا سوکھا تھا کہ پھر نہ اترا پر نہ اترا جب دیکھا کہ بچی بھوک کے مارے پھڑکی چلی جاتی ہے ناچار انا رکھی اور وہ عذاب اٹھائے کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ خدا نے زندگی بخشی تھی کہ تم پل گئیں۔

حمیدہ: تو اللہ میاں بڑے اچھے ہیں ہم سب کو کھانے کو دیتے ہیں ہماری نئی بوا کے واسطے دودھ اتارتے ہیں۔ لیکن اما جان اللہ میاں سے ہمارا کچھ رشتہ ناتا ہے کہ اتنے سلوک کرتے ہیں۔

میں: رشتہ ناتا یہ کہ ہم ان کے بندے ہیں۔ مردان کے غلام ہیں۔ عورتیں ان کی لونڈیاں ہیں۔

حمیدہ: لونڈی غلاموں کے ساتھ اتنا سلوک کہ کوئی اپنے بچوں کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔ لیکن لونڈی غلام تو اپنے مالک کی خدمت کرتے ہیں ٹہل کرتے ہیں۔ ہم اللہ میاں کا کون سا کام کرتے ہیں۔

میں: یہی نماز جو تم نے اپنے باپ کو پڑھتے دیکھی اور جس کو عبادت کہتے ہیں۔

حمیدہ: ہاں نماز اللہ میاں کا کام ہے تو سبھی کو نہ پڑھنی چاہئے کیونکہ لونڈی غلام سب ہیں۔ اللہ میاں کی دی ہوئی روٹی سب کھاتے ہیں۔

میں: بیشک خدا کی عبادت سب پر فرض ہے۔

حمیدہ: اماجان تم تو نماز نہیں پڑھتیں کیا تم اللہ میاں کی لونڈی نہیں ہو اور کیا تم اس کی دی ہوئی روٹی نہیں کھاتیں۔ حمیدہ نے جو سادہ دلی اور بھولے پن سے یہ الزام دی مجھ کو اس قدر شرم آئی کہ زمین پھٹ گئی ہوتی تو میں سما جاتی۔

میں: میں لونڈی بے شک ہوں اور خدا ہی کی دی ہوئی روٹی کھاتی ہوں لیکن کیا بعض لونڈیاں نکمی اور کام چور اور نمک حرام اور بے غیرت نہیں ہوتیں ویسی ہی اللہ میاں کی ایک لونڈی میں ہوں۔

حمیدہ: ابا جان بھی تو اب بیماری سے اٹھ کر نماز پڑھنے لگے ہیں۔ کیا اس سے پہلے وہ خدا کی دی ہوئی روٹی نہیں کھاتے تھے۔

یہ سن کر نصوح کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔

میں: وہ بھی برا کرتے تھے۔

حمیدہ: اچھی اماجان اللہ میاں خفا ہوتے ہوں گے۔

میں: خفا ہونے کی تو بات ہی ہے۔

حمیدہ: ایسا نہ ہو کہ روٹی بند کر دیں تو ہم کہاں سے کھائیں گے اور اگر نئی بوا کا دودھ سوکھ جائے گا تو ہماری نئی روئے گی۔

یہ کہہ کر حمیدہ رونے لگی۔ میں نے اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور پیار کیا لیکن جس قدر میں اس کو تسلی دیتی تھی وہ اور دوگنا روتی تھی۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور مجھ کو روتے دیکھ کر وہ اور بھی بیتاب ہو گئی۔ آخر بڑی بڑی مشکلوں سے میں نے اس کو سنبھالا اور کہا کہ حمیدہ تم ڈرو مت اللہ میاں کا یہ دستور نہیں ہے کہ جو لونڈی غلام کام نہ کریں ان کا کھانا بند کر دیں۔

حمیدہ: سچ میں۔

میں: ہاں ہاں تم گھبراؤ مت۔

حمیدہ: اچھی اماجان نئی کو پلا کر دیکھو دودھ ہے یا نہیں۔

میں: بیٹی نئی کو سونے دو اور دودھ سے اطمینان رکھو دودھ خدا کا دیا ہوا بہت ہے۔

حمیدہ: ہمارے گھر میں تو لونڈی غلام نہیں نوکر چاکر ہیں مگر کام نہیں کرتے تو تنخواہ کاٹ لی جاتی ہے اباجان

جرمانہ کر دیا کرتے ہیں گھر سے نکال دیتے ہیں۔ اللہ میاں اپنے لونڈی غلاموں پر بھی خفا نہیں ہوتے تو ایسے مالک کا کام تو اور بھی جی لگا کر کرنا چاہئے کیا کام نہ کرنا اور کھانا بے غیرتی نہیں ہے۔

میں: بری بے غیرتی کی بات ہے۔

حمیدہ: اما جان میں نے تو آج تک نماز نہیں پڑھی اور نہ مجھ کو نماز پڑھنی آتی ہے اور تم تو دن رات میں دو ہی مرتبہ کھانا کھاتی ہو۔

میں: نہیں معلوم کتنا دفعہ کھاتی ہوں۔ مجھ پر اللہ میاں ضرور خفا ہوئے ہوں گے۔

یہ کہہ کر پھر حمیدہ روئی اور ڈر کے مارے دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور پھر میں نے سمجھایا کہ حمیدہ ڈرو مت اللہ میاں تم سے ناخوش نہیں ہیں۔ ابھی تم بچی ہو تم کو نماز معاف ہے۔

حمیدہ: کھانا تو مجھ کو بھی سب کے برابر بلکہ سب سے اچھا اور زیادہ ملتا ہے۔

میں: ہاں ملتا ہے اور یہ بھی خدا کی مہربانی ہے کہ تم کو کام معاف کر رکھا ہے۔

حمیدہ: پھر اللہ میاں مجھ کو کیوں کھانا دیتے ہیں۔

میں: اس واسطے کہ جب بڑی ہو جاؤ تو اس کے بدلے کا بہت سا کام کرو۔

حمیدہ: لیکن کیا میں اب کام نہیں کر سکتی۔ دیکھو میں تم کو پان بنا دیتی ہوں۔ ابا جان کو پانی پلا دیتی ہوں۔ نئی بوا کو بہلا لیتی ہوں۔ کیوں اما جان کرتی ہوں۔

میں: ہاں بوا جان تم تو میرے بہت کام کرتی ہو پنکھا جھل دیتی ہو، دھاگا بٹ دیتی ہو سوئی میں دھاگا پرو دیتی ہو جو چیز مجھ کو درکار ہوئی ہے لے آتی ہو۔

حمیدہ: تو کیا میں اللہ میاں کا کوئی چھوٹا سا کام بھی نہیں کر سکتی۔ کیا نماز پڑھنا بڑا مشکل کام ہے۔ میں تو دیکھتی ہوں ابا جان ہاتھ منہ دھو کر باندھے کھڑے رہتے ہیں کیا اتنا مجھ سے نہیں ہو سکتا۔

میں: اس کے سوائے کچھ پڑھنا بھی ہوتا ہے۔ جس کو تم کہتی تھیں کہ چپکے چپکے باتیں کرتے جاتے ہیں۔

حمیدہ: وہ کیا باتیں ہیں۔

میں: خدا کی تعریف اور اس کے احسانوں کا شکریہ، اپنے گناہوں کا اقرار اور ان کی معافی کی درخواست، اس کے رحم کی تمنا، اس کے فضل کی آرزو بس یہی نماز ہے۔

حمیدہ: یہ سب باتیں اسی طرح کرتے ہوں گے جیسے ہم لوگ آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔

میں: اور کیا۔

حمیدہ: مگر ابا جان تو کچھ اور ہی طرح کی بولی بولنے لگتے ہیں۔

میں: وہ عربی زبان ہے۔

حمیدہ: وہ تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اماجان تم جانتی ہو۔

میں: نہیں میں بھی نہیں جانتی۔

حمیدہ: تو کیا خدا سے عربی ہی زبان میں باتیں کرنی ہوتی ہیں۔

میں: نہیں وہ سب کی بولی سمجھتا ہے بلکہ وہ تو دلوں کے ارادوں اور طبیعتوں کے منصوبوں سے بھی واقف ہے۔

حمیدہ: یہ کیوں کر۔

میں: اس واسطے کہ وہ ہر وقت ہر جگہ موجود ہے۔ کوئی چیز کوئی بات اس سے مخفی نہیں۔ سب کو دیکھتا ہے سب کی سنتا ہے اگلے پچھلے کل حالات اس کو معلوم ہیں۔

حمیدہ: (گھبرا کر) کیا اللہ میاں یہاں ہمارے گھر میں بیٹھے ہیں۔

میں: گھر میں کیا ہمارے پاس بیٹھے ہیں مگر ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔

یہ سن کر حمیدہ نے جلدی سے اوڑھنی اوڑھ لی اور سنبھل کر مودب ہو بیٹھی اور مجھ سے بھی آہستہ سے کہا: اماجان سر ڈھک لو۔ اس کے بعد حمیدہ پر کچھ ایسی ہیبت غالب آئی کہ میری گود میں تھوڑی دیر تک چپ پڑی رہی آخر آنکھ لگی، سو گئی۔ میری ٹانگیں سُن ہونے لگیں تو میں نے آہستہ سے چارپائی پر لٹا کر بیدارا کو پاس بٹھا دیا کہ دیکھ ہاتھ رکھے رہیو ایسا نہ لڑکی سوتے سوتے ڈر کر چونک پڑے اور میں یہاں چلی آئی۔ مجھ کو حمیدہ کی باتوں سے ایسا لگا کہ اندر سے کلیجہ تھر تھر کانپا جاتا تھا۔

نصوح: کیوں ڈر کی اس میں کیا بات تھی۔

فہمیدہ: میں کہتی تھی کہ ایسی چھوٹی سی لڑکی اور ایسی باتیں کچھ اس کو ہو تو نہیں گیا۔

نصوح: مذہب میں بڑی خوبی اور عمدگی تو یہی ہے کہ وہ ایسی باتوں کی تعلیم کرتا ہے جن کو ہر شخص سمجھ سکتا

ہے۔ مسائل دینی آدمیوں کے بتائے ہوئے سمجھے اور لوگوں کی گڑھی ہوئی پہیلیاں نہیں ہیں کہ ان کے حل کرنے اور بوجھنے کو بڑا غور وخوض درکار ہو بلکہ اس حکیم برحق کے باندھے ہوئے اصول اور ٹھہرائے ہوئے ضابطے ہیں اور اصول بھی کیسے سلیس اور آسان۔ ضابطے سہ اور بدیہی۔ نہیں معلوم انسان کی عقل پر کیا پتھر پڑ گئے ہیں کہ اتنی موٹی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ زمین آسمان چاند سورج ستارے انواع واقسام کے حیوانات رنگ برنگ کے نباتات ساری دنیا تمام زمانہ اتنا بڑا کارخانہ جس میں کا ایک پتا اٹھا کر دیکھو تو ہزار صنعتوں سے بھرا ہوا ہے آخر خود بخود تو نہیں ہو گیا ضرور کوئی اس کا بنانے والا ہے اور پھر اس نے جو انسان کو ایک خاص صفت عقل عطا کی ہے کچھ تو اس تخصیص کا مطلب ہے۔ مگر ہے کیا کہ انسان اس تصور کو اپنے ذہن میں آنے ہی نہیں دیتا ورنہ ساری خدائی خدا کی گواہی دے رہی ہے۔

برگ درختان سبزور نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

حمیدہ نے کوئی بات اچنبھے کی نہیں کہی۔ اچنبھے کی بات تو یہ ہے کہ ہم میں نادان بچوں کے برابر بھی عقل نہیں۔ ڈوب مرنے کی جگہ ہے زمین میں گڑ جانے کا مقام ہے۔ بلکہ حمیدہ کی باتوں کو میں ایک فال نیک اپنی کامیابی کی سمجھتا ہوں افسوس ہے تم اس کو میرے پاس نہ لے آئیں۔ اس کی ہر ہر بات لوح دل پر کندہ کرنے کے لائق ہے اور یہ باتیں اس نے کیا کہیں خدا نے اس کے منہ سے کہلوائیں۔ بیٹی کیا ہے سچ پوچھو تو ہمارے لئے ہدایت کا فرشتہ ہے اور بچے جو معصوم کہلاتے ہیں اسی سبب سے کہ ان کے دل لوث دنیا سے پاک اور تیرگی گناہ سے صاف ہوتے ہیں۔ الحمدللہ کہ ایک سے تو اطمینان ہوا اب یہ بتاؤ کہ اوروں کے واسطے کیا انتظام کرنا ہوگا۔

فہمیدہ: تم ہی کوئی تجویز سوچو۔

نصوح: میں نے تو یہ سوچا ہے کہ لڑکیوں کو تم سنبھالو اور لڑکوں کو میں سمجھ لوں گا۔

فہمیدہ: بھلا میں بھی تو سمجھوں کیوں کہ سمجھ لوگے کہ وہی تدبیر میں بھی کروں۔

نصوح: میں پہلے چھوٹوں سے شروع کروں گا امید ہے کہ جلد راہ پر آجائیں بڑوں کا مجھ کو بڑا کھٹکا ہے یہ تو میں خوب جانتا ہوں کہ یہ نیا ڈھنگ دیکھ کر ان کے کان کھڑے ہوں گے مگر نہیں معلوم کس سے کیا معاملہ پیش آئے۔ تم اتنا کرو کہ ایک تو میرا تمہارا دونوں کا کام ایک ساتھ شروع ہو جب اندر باہر دونوں جگہ ایک ہی بات کا چرچا

ہوا تو کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ دیکھو خاص کر ہمارے پیچھے پڑے ہیں۔ اولاد اولاد سب برابر ان سے کچھ تعرض نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ تمہاری ہر ادا سے یہ بات پیدا ہو کہ اس معاملے میں ہم دونوں کو ایک اہتمام خاص ہو کیوں کہ ذرا سا ضعف بھی ظاہر ہوگا تو تمام تر انتظام درہم و برہم ہو جائے گا۔

فہمیدہ: انشاء اللہ اس کے خلاف نہ ہوگا۔

لفظ و معنی

استعجاب - حیرت، تعجب

عبادت - بندگی

رونگٹے - جلد کے بال

خفا - ناراض

بیجا - نامناسب

غلہ - اناج

شدت - سختی

الامان - پناہ تلاش کرنا (عربی اصطلاح ہے)

زمین پھٹ جائے

اور سما جانا - بہت زیادہ شرمندہ ہونا

نکمی - کام چور

ضبط کرنا - برداشت کرنا

بیتاب ہونا - بے چین ہونا، بے قرار ہونا

بے غیرت - بے حیا، بے شرم

منصوبہ - پروگرام کرنے کا منظم انداز

مخفی - چھپا ہوا، پردے میں

مودب - ادب کے ساتھ

آنکھ لگنا - اونگھنا، نیند آنا، جھپکی لینا

معمہ - بجھول، پہیلی

سہل - آسان

ضابطہ - اصول، قاعدہ

بدیہی - سامنے

انواع - قسم (نوع کی جمع)

نباتات - پیڑ پودے (نبات کی جمع)

خود بخود - اپنے آپ سے

تخصیص - خاص کرنا، مخصوص کرنا

برگ - پتی، پتہ

لوح - تختی

لوث - غرض، مقصد

تیرگی - تاریکی، اندھیرا

کھٹکا - ڈر، شبہ

تعرض - چھیڑ چھاڑ

کان کھڑے ہونا - ہوشیار ہونا

درہم برہم ہونا - ادھر ادھر ہونا، برباد ہونا

ضعف - کمزوری

پراگندہ - آلودہ، گرد و غبار سے اٹا ہوا

صفت - خوبی

گھڑی - لمحہ، پل

آپ نے پڑھا

□ زیرِ نصاب اقتباس ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'توبۃ النصوح' کے ایک اقتباس سے ماخوذ ہے۔ جس کا نقطۂ نظر خا

اصلاحی ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ ان کے بیشتر ناول اصلاحی نقطہ نظر کے حامل رہے ہیں جس کا پس منظر یہ ہے کہ نذیر احمد کے زمانے میں اردو ناول نے ایک فن کی حیثیت اختیار نہیں کی تھی۔ اس لئے اپنے بچوں کی اخلاقی تعلیم کے لئے انہوں نے اخلاقیات اور بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق چند کتابیں لکھیں جو بعد میں اردو ناول کے فروغ کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔

- ناول 'توبتہ النصوح' کا یہ اقتباس نصوح کی بیوی فہمیدہ اور منجھلی بیٹی حمیدہ کی آپسی گفتگو پر مشتمل ہے۔ جس میں تعلیم و تربیت خصوصاً دینی تعلیم کو گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ جس کا بنیادی مقصد بچوں کے عبوری دور میں ان کا ذہنی اصلاح کرنا ہے۔ اس گفتگو میں بہت سے پہلو ایسے بھی آئے ہیں جن سے بالواسطہ طور پر دینی تعلیم سے متعلق بچوں کے ذہن کو بیدار کرنا ہے۔
- توبتہ النصوح کے مرکزی کردار خود نصوح ہیں اور اپنے خاندان کے مکھیا بھی ہیں جنہوں نے خاندان کے تمام افراد کی اصلاح کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ نصوح کے بڑے بیٹے کلیم کا کردار منفی جہت کا حامل ہے اور ایک لڑکی عالیہ بھی کلیم کی راہ کی ہی مسافر ہے۔ جبکہ نصوح کا دوسرا لڑکا سلیم اور حمیدہ و صالحہ مثبت خیالات کے حامل ہیں۔ نظریوں کے اس اختلاف میں اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. نذیر احمد کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
2. نذیر احمد کے کسی دو ناول کا نام لکھیے۔
3. فہمیدہ اور حمیدہ نصوح کی کون تھیں؟
4. نذیر احمد نے کس کی تعلیم و تربیت کے لئے ناول لکھے۔
5. زیر نصاب ناول کے اقتباس سے دو کرداروں کے نام لکھئے۔

مختصر سوالات

1. نذیر احمد کے بارے میں پانچ جملے لکھئے۔
2. فہمیدہ کے کردار پر مختصراً روشنی ڈالئے۔
3. اردو کے کسی پانچ ناول کا نام لکھئے۔
4. سرسید کے عناصر خمسہ کی حیثیت سے نذیر احمد کی خدمات پر روشنی ڈالئے۔

5. اصلاحی جذبے پر پانچ جملے لکھیے۔

طویل سوالات

1. نذیر احمد کی ناول نگاری کا جائزہ لیجیے۔
2. اردو میں ناول نگاری پر ایک مضمون لکھیے۔
3. زیر نصاب اقتباس کا مرکزی خیال پیش کیجیے۔
4. درج ذیل الفاظ سے جملے بنائیے:

نوع، قسم، ضد، بخار، ضابطہ، لفظ، ادب

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے اصلاحی ناول پر ایک مذاکرہ کیجیے۔
2. لائبریری جا کر اردو کے دس ناول نگاروں کی ایک فہرست بنائیے۔

مکتوب نگاری

مکتوب یا خطوط نگاری خیریت اور ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیالات کا ایک موثر اور روایتی ذریعہ ہے۔ دور حاضر میں یہ ایک مقام پر اس لئے بھی مستحکم ہوا کہ اسے ادارہ جاتی طور پر اعتبار بخشا گیا۔ غالباً شیر شاہ سوری کے دور میں اس کو ابتدائی طور پر منظم کیا گیا۔ عہد مغل میں فارسی میں مکتوب نویسی کا رواج تھا۔ پچھلے تمام بادشاہ، امراء اور رؤسا کے خطوط جو بھی محفوظ ہیں وہ سب کے سب فارسی میں ہیں۔ شعرا کے تمام نثری کام فارسی میں ہی ملتے ہیں۔

غالب نے اپنے احباب کو خطوط اردو میں لکھنے شروع کئے۔ تنہا غالب نے ہی تمام عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کو تقریباً ۹۰۰ مکتوب لکھے ہیں۔ ان کے خطوط کے دو مجموعے ان کی زندگی میں ہی شائع ہو گئے۔ اس کے بعد سرسید، حالی، شبلی، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال، مہدی افادی، عبدالماجد دریابادی، پریم چند، فیض احمد فیض، صفیہ اختر وغیرہ کے خطوط کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

مکاتیب یا خطوط بالکل ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں کیوں کہ اس میں لکھنے والا اکثر اپنے دلی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے اور اپنے جذبات کو خطوط کی بیساکھی کے سہارے مخاطب تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ مکتوب نگار اپنے احوال و کوائف کے ساتھ ساتھ اپنی روایات، اپنی معاشرتی اور عصری حسیات تک اس میں مقید کر لیتا ہے، جو بعد میں ایک دستاویز کی شکل بن کر محفوظ ہو جاتے ہیں۔

اسداللہ خاں غالب

مرزا اسداللہ خاں غالب 27 / دسمبر 1797ء کو اپنی ننھیال آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ اور والدہ کا نام عزت النساء بیگم ہے۔ غالب بچپن میں ہی یتیم ہوگئے تو ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے انہیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ مولوی معظم کے مکتب میں غالب نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہیں سے ان کی شعرگوئی کی ابتداء ہوئی۔

ان کی شادی بھی کم عمری میں تقریباً 13 برس کی عمر میں الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ شادی کے فوراً بعد ہی انہوں نے دہلی میں سکونت اختیار کرلی۔ حالانکہ انہیں وہاں مالی پریشانیوں کا سامنا رہا۔ خاندانی پنشن کے سلسلے میں انہوں نے کلکتہ کا سفر بھی کیا۔ آخر میں جب باضابطہ وظیفہ قلعۂ معلیٰ سے جاری ہوا تو حالات کسی قدر بہتر ہوئے۔ مگر غدر نے ان کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ اسی پریشانی میں آخرکار 15 / فروری 1869 کو ان کا انتقال ہوگیا۔

غالب نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھا۔ اردو میں خطوط کے دو مجموعے 'عود ہندی' اور 'اردوئے معلیٰ' کے نام سے چھپے ہیں۔ وہ پہلے اسد تخلص کرتے تھے بعد میں غالب کرنے لگے۔

غالب نے اپنے مکتوب کے ذریعے اردو کو بیش بہا دولت سے نوازا ہے۔ ان کے مکتوبات میں بے تکلف اور سادگی سے لبریز ماحول ملتا ہے۔ لہجے کی تندی اور ظریفانہ رنگ سے ان کے خطوط میں ایک خاص اندازِ نظر پیدا ہوگیا ہے۔ ان کے خطوط بالکل مکالماتی انداز کے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ 'میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنادیا ہے'۔ ان کے خطوط سے ہمیں جہاں ان کے ذہنی رویے کی پرکھ ہوتی ہے وہیں ان کی شخصیت کے تہہ در تہہ پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔

سید شاہ کرامت حسین کرامت ہمدانی کے نام

دہلی، محلہ بلی ماراں

10/جولائی 1860ء

شاہ صاحب کو غالب ناتواں کا سلام پہنچے۔ بھائی میرا کیا حال پوچھتے ہو۔ زندہ ہوں مگر مردے سے بدتر۔ حوادثِ زمانہ و عوارضِ جسمی سے نیم جاں ہو رہا ہوں۔ غذا کی حقیقت یہ ہے کہ صبح کو آٹھ دس بادام کا شیرہ، دوپہر کو سیر بھر گوشت کا پانی، دو گھڑی دن رہے دو یا تین تلے ہوئے کباب اور بس۔ نسیان حد سے گزر گیا ہوں۔ خط مع کلام اصلاح طلب بکس یا کتاب میں رکھ دیتا ہوں اور بھول جاتا ہوں۔ ایسی حالت میں اگر خط کا جواب یا اصلاحی غزل دیر میں پہنچے تو شکایت نہ کیا کرو۔ مجھے زندہ سمجھتے ہو جو تازہ کلام کی فرمائش کرتے ہو، غنیمت نہیں جانتے کہ مردہ کچھ لکھ کر بھیج دیتا ہے۔ سو روپے جو تم نے بھیجے وہ مجھے ملے۔ میں دوستوں کی خدمت گزاری میں کبھی قاصر نہیں رہتا۔ اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔ میں یوں ہی خدمت گذاری کو حاضر ہوں۔ جب چاہو اپنا کلام بھیجو۔ تمہاری تینوں غزلیں بعد اصلاح بھیجتا ہوں۔ چشم بددور، تمہاری طبیعت مناسب اس فن کے ہے۔ اللہ نگاہِ بد سے محفوظ رکھے۔

نجات کا طالب

غالب

ABDIEL SOLUTIONS ABSOL PATNA

لفظ و معنی

ناتواں - کمزور

حوادث - حادثہ کی جمع، واقعہ ہو جانا

عوارض جسمی ۔ جسمانی بیماریاں

نیم جاں ۔ کمزور، آدھی جان

نسیان حد ۔ ذہن کے دریچے سے نکل جانا، بھول جانا

اصلاحی غزل ۔ اصلاح کے لئے دی گئی غزل، تصحیح کرنا، درست کرنا

کلام ۔ بات، مواد جو درستگی کے لئے پیش ہو

غنیمت ۔ کسی حد تک حاصل ہونا، قابل تشفی

خدمت گذاری ۔ دل جوئی کرنا، جذبات کا خیال رکھنا

چشم بددور ۔ بری نظر دور ہو، بری نظر سے پناہ ہو

نگاہ بد ۔ بری نظر

آپ نے پڑھا

- سید کرامت حسین کرامت ہمدانی کے نام غالب نے اپنے اس مکتوب میں اپنی محبت اور دوستی کو اس طرح واضح کیا ہے کہ میں کمزور ہوں، بیمار ہوں میرا حال کیا پوچھتے ہو۔ زندگی بس زندگی کی حد تک باقی ہے۔ غذا کے نام پر بادام کا شیرہ اور گوشت کا پانی۔ سرشام چند کباب سے جی کو سیر کیا جاتا ہے۔ ایسے میں کلام کی اصلاح ایک مشکل کام ہے مگر وہ اسے کر کے بھی علاحدہ رکھ کر بھول جاتے ہیں۔ اب ایسی حالت میں جو کام ہو جاتا ہے وہی غنیمت ہے اور لائق شکر یہ ہے کہ وہ اس کو کسی طرح اصلاح کر ڈالتے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ان کا بھیجا ہوا سو روپیہ مل تو گیا مگر دوستی میں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ان کی طبیعت شاعرانہ ہے اس کے لئے انہیں مبارک باد دی گئی ہے اور سراہا گیا ہے اور بری نظر سے بچے رہیں اس کی دعا کی گئی ہے۔
- اس مکتوب کی زبان انتہائی رواں، صاف شفاف اور دلکش ہے۔ ایک ایسے شخص نے جس نے فارسی میں بہترین شاعری کی ہو اپنے عہد میں عمدہ اور با محاورہ زبان کا استعمال کیا ہے جو آج کے تناظر میں بھی اسی طرح اہم اور کلیدی حیثیت رکھتی ہے اور ہم ترسیل و ابلاغ کے مرحلے سے آسانی سے گذر جاتے ہیں۔ ایک انسان جب دوسرے کو اپنی باتیں کہتا ہے تو اس تک پہنچنے کی یہ اولین شرط ہوتی ہے کہ اگلا اس کی زبان کو سمجھ رہا ہے یا کہ نہیں۔ غالب کو اس میں کمال کا درجہ حاصل ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. غالب کی سنہ پیدائش کیا ہے؟
2. غالب کہاں پیدا ہوئے؟
3. غالب کے خطوط کے کسی ایک ایک مجموعہ کا نام لکھئے۔
4. غالب نے کتنے خطوط لکھے؟

مختصر سوالات

1. مکتوب نگاری کے فن سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔
2. غالب نے اپنے خطوط میں کن باتوں کا اظہار کیا ہے؟
3. غالب نے اپنے خط میں دوستی اور محبت کا اظہار کن لفظوں میں کیا ہے؟
4. غالب کا تعارف مختصراً لکھیے۔
5. غالب کے خطوط کی زبان پر پانچ سطریں لکھیے۔

طویل سوالات

1. غالب کے لکھے ہوئے خطوط کس نوعیت کے ہیں؟
2. غالب کے علاوہ کن قلم کاروں کے مکاتیب کتابی شکل میں شائع ہوئے؟
3. غالب کے خطوط سے اردو نثر کو کیا فائدہ پہنچا؟
4. مکتوب نگاری کے کیا فائدے ہیں؟

آیئے، کچھ کریں

1. غالب کی طرز میں کسی موضوع پر اپنے دوست کے نام ایک خط لکھئے۔
2. غالب کی خطوط نگاری کے موضوع پر اپنی جماعت میں تقریر کیجئے۔

عبدالغفور شہباز

پورا نام سید محمد عبدالغفور اور شہباز تخلص تھا۔ شہباز موضع سرمیرا، باڑھ کے رہنے والے تھے۔ 'سفینۂ اردو' میں انہیں آرہ کا باشندہ بتایا گیا ہے جو درست نہیں ہے۔ انہوں نے بہت کم سنی میں لکھنا شروع کیا۔ اپنے مظفر پور کے قیام کے دوران انہوں نے انٹرنس پاس کیا اور عربی و فارسی میں مہارت حاصل کر لی۔ اس کے علاوہ انگریزی کے بھی شناسا ہو گئے۔

بیس سال کی عمر میں ان کی شادی شمس النساء خاتون ساکن باڑھ (پٹنہ) کے ساتھ ہوئی۔ ان کی بیگم دس برسوں کی رفاقت ہی دے پائیں۔ اس کے بعد انہوں نے دوسری شادی مولوی بشیر الدین احمد فرزند ڈاکٹر نذیر احمد کی سالی اشرف النساء سے 1898ء میں کی۔ وہ خوش حال گھرانے سے تھے مگر بعد میں ان کی حالت کچھ اچھی نہیں رہی۔ جس کے باعث ان کی انگریزی کی تعلیم متاثر ہوئی۔ بہرحال اپنے بھائی کی وساطت سے وہ سب رجسٹرار ہو گئے۔ پھر ان کا مضمون نگاری کا شوق پھلنے پھولنے لگا۔ اردو اخبار 'دارالسلطنت' 1880ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اہتمام شروع ہوا تو اس میں مدیر ہو گئے۔ اس کے بند ہونے کے بعد انہوں نے پٹنہ کے بی این کالج میں داخلہ لیا۔ اودھ پنچ (لکھنو)، الپنچ (پٹنہ)، مخزن (لاہور) اور اودھ اخبار (لکھنؤ) میں لکھنے لگے۔ بھوپال کی بیگم صاحبہ کو ان کے علم و کمال کا علم ہوا تو بھوپال آنے کی دعوت دی گئی۔ وہاں وہ 1905ء میں ناظم تعلیمات ہو گئے۔ بیگم بھوپال کی کچھ شرطیں تھیں جو انہیں نامنظور تھیں۔ اپنی دوسری اہلیہ کے انتقال کے بعد وہ نہ اورنگ آباد کالج کے پروفیسر رہے اور نہ بھوپال کی ڈائرکٹری کے رکن۔ اسی کسمپرسی کی حالت میں وہ سخت علیل ہو گئے اور 30 نومبر 1908ء کو اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔

شہباز نے مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی۔ ان کے کلام میں رباعیات شہباز، خیالات شہباز، تفریح القلوب اور باقیات شہباز میں مناظرہ دین و دنیا، قرآن السعدین، سالگرہ مبارک حضور نظام الدین، خدا کی رحمت، عید سعید، عروس شادی، نوحہ، تین خمسے، تہذیب قیس، قانون قسمت وغیرہ جیسی نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ کلیات نظیر اکبرآبادی، مقدمہ موعظہ حسنہ، مصنفہ ڈاکٹر نذیر احمد، مقدمہ خیالات آزاد، مقدمہ سوانح عمری مولانا آزاد، دیباچہ نوابی دربار، دیباچہ نوابی کھیل، مقالات جمالیہ، ترجمہ روبنچری، سیرت خسروی اور زندگانی بے نظیر ان کی تصنیفات و تالیفات میں شامل ہیں۔

شہباز نئی تعلیم و تہذیب کے دلداہ تھے اور پیروئی مغربی کی دعوت عام دیتے تھے۔ شہباز نظیر، حالی اور اکبر کے مقلد اور پیروکار ہیں۔ سائنسی علوم سے بھی کافی رغبت رکھتے تھے۔ پیش نظر مکتوب ان کے مکاتیب سے ماخوذ ہے۔

اپنی بیٹی صغریٰ کے نام

کیوں جی صغریٰ! تمہاری اماں خط کیوں نہیں لکھتیں؟ مزاج تو ان کا اچھا ہے امید ہے تمہارا سبق ناغہ نہ ہوتا ہوگا۔ حقوق اولاد کے شعر جب تم زبانی پڑھتی تھیں اور تمہاری چھوٹی بہن بھی ساتھ ساتھ پڑھنا چاہتی تھی، دونوں کے حق میں میرے دل سے دعا نکلتی تھی۔ بشریٰ کو تم مراۃ العلم تھوڑا تھوڑا پڑھاتی رہو تو اچھی بات ہے۔ میں نے تمہاری اماں کو پڑھایا۔ وہ ماشاء اللہ تم کو پڑھاتی ہیں۔ تم بھی اگر بشریٰ کو پڑھاؤ تو کیا مضائقہ ہے۔ حقوق اولاد جب تم تمام کرلوگی میں تم کو ضرور انعام دوں گا۔ راہِ نجات کے تمام ہونے میں ابھی بہت دیر ہے۔ اس کے انعام کا وعدہ ابھی سے کرنا فضول ہے۔ میں، خدا نے چاہا تو، محرم کی تعطیل میں آؤں گا۔ دیکھو تیار رہنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے سامنے اپنی کتاب ٹھیک سے نہ پڑھ سکو۔ اخلاق ہندی کا آموختہ تم روز نہیں پڑھتیں۔ بھئی یہ بات اچھی نہیں۔ اگر چھوڑ دوگی بھول جاؤ گی اور کی کرائی محنت برباد ہوگی ادھر میں اصغری کو دیکھنے نہیں گیا مگر نہیں گیا تو کیا ہوا۔ لوگوں سے تو معلوم ہوتا رہتا ہے کہ وہ غضب کی ترقی کر رہی ہے، تم کو اگر شوق ہو اور محنت کرو تو دو چار مہینے میں اب بھی تم اس کو سبق دے سکتی ہو۔ مجھ کو چار پانچ روز سے ایک دنبل سخت ستا رہا ہے۔ اب کسی قدر آرام ہے۔ میں نے یہ خط صاف صاف لکھا ہے۔ یقین ہے غور کروگی تو بغیر کسی کی مدد کے آپ پڑھ لوگی۔ بشریٰ کو دعا کہو اور اپنی انانی کی خدمت میں تسلیم۔

عبدالغفور (شہباز)

لفظ و معنی

باشندہ - رہنے والا، جس جگہ پر قیام ہو

نخداں - جانکار ہونا، کسی خاص موضوع سے واقف ہونا

ساکن - رہنے والا خاص مقام کا